# عامر بن علی کی شاعری کا فکری و فنی جائزہ


مقالہ نگار

ساجد علی

ایم فل اردو

سیشن ۱۸-۲۰۱۶ء


یہ مقالہ ایم۔فل اُردو کی جزوی تکمیل اور حصولِ سند کے لیے
شعبۂ اُردو میں جمع کرایا گیا۔

شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد



اگست ۲۰۱۸ء

# عامر بن علی کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ

مقالہ برائے

ایم فل (اردو)

سیشن ۱۸۔۲۰۱۶ء


مقالہ نگار

ساجد علی

رول نمبر ۶۰۲۹

رجسٹریشن نمبر: 2014-GCUF-013596

نگران مقالہ

ڈاکٹر رابعہ سرفراز

ایسوسی ایٹ، شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد



شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد

اگست ۲۰۱۸ء

# عامر بن علی کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ

مقالہ نگار

ساجد علی

ایم فل اُردو

سیشن ۱۸۔۲۰۱۶ء

یہ مقالہ ایم فل اُردو کی جزوی تکمیل اور حصول سند کے لیے
شعبہ اردو میں جمع کرایا گیا۔

شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد

اگست ۲۰۱۸ء

# عامر بن علی کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ

مقالہ برائے

ایم فل (اردو)

سیشن ۱۸۔۲۰۱۶ء


مقالہ نگار

ساجد علی

رول نمبر ۶۰۲۹

رجسٹریشن نمبر: 2014-GCUF-013596

نگران مقالہ

ڈاکٹر رابعہ سرفراز

ایسوسی ایٹ، شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد



شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد

اگست ۲۰۱۸ء

# ماحصل

دنیائے ادب گونا گوں شخصیات سے بھری پڑی ہے جنہوں نے اپنے فکر وفن کی بدولت ادب میں بے پناہ اضافے کیے۔ان میں چند ایک اپنے فن کی بدولت شہرت اور نیک نامی کے مستحق ٹھہرے اور کچھ اپنے زمانے میں اپنی انا،خودداری، سادگی اور عاجزی کی بدولت گم نام رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی کارہائے نمایاں رنگ لائے اور ان کو گم نامی کے کنویں سے نکال کر شہرت کے آسمان تک پہنچایا۔کیونکہ کسی کی صلاحیتیں دب نہیں سکتیں۔

اہلِ علم طبقہ انصاف کرے یا نہ کرے وقت ضرور انصاف کرتا ہے، دراصل یہ ان شعرا کا حسن بیان اور ان ادیبوں کی قدرتِ کلام کی تاثیر ہوتی ہے جو انہیں زندہ رکھتی ہے۔وہ اپنے عوض اپنا کلام چھوڑ کر دل عالم سے مٹ نہیں پاتے بلکہ تا ابد وہ ادب کے آسمان پر آفتاب ومہتاب کی طرح چمکتے ہیں۔

اہلِ علم وادب طبقہ اگر آج تک میر وسودا کو اسی شان وشوکت کے ساتھ اُردو ادب میں زندہ رکھتا ہے۔تو ان کی شاعرانہ عظمتوں کی بدولت غالب ومومن آج تک اپنی قادرالکلامی کی بدولت اُردو غزل میں معمار سمجھے جاتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی اور الطاف حسین حالی اُردو نظم کو نیا لہجہ اور نئے موضوعات عطا کرنے میں بقائے دوام کے دربار میں محفوظ ہیں۔علامہ اقبال اپنی شاعرانہ قد وقامت کی بدولت نہ صرف زندہ ہیں بلکہ آنے والی صدیاں ان کی شاعرانہ عظمت کی معترف رہیں گی۔ن۔م راشد اور مجید امجد اُردو نظم کی نئی آواز آزاد نظم میں بھرپور قوتِ اظہار کے سبب اہلِ علم کی توجہ کا مرکز ہیں۔

ان کے علاوہ بھی علم وادب کے کتنے درخشندہ ستارے ہیں جو اپنے زمانے میں عدم توجہ کے بادل میں ڈھکے رہے لیکن جب اہلِ بصیرت حضرات نے ان کے ساتھ انصاف کیا اور ان کے علم وادب کا ادبی زاویوں کے مطابق جائزہ لیا تو یقیناً ان کا قدردان بننا پڑا۔

عامر بن علی کا شمار بھی کچھ ایسے ہی اہلِ سخن طبقہ میں ہوتا ہے۔ان کی شاعرانہ صلاحیتیں زمانے کو نہیں تو اہلِ ادب کو ضرور متاثر کرتی ہیں۔ان کے ادبی کارناموں نے قارئینِ ادب، اہلِ ذوق اور اہلِ علم طبقہ کی فکر کو عامر بن علی سے ہمدردی کی طرف مائل کیا۔ان کا عامر بن علی کی طرف مائل ہونا تھا تو ان کی شخصیت اور شاعری کی کئی پرتیں نکھر کر سامنے آئیں۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے وہ حساس شاعر جذباتی فنکار اور زندہ دل انسان ہیں۔خوش پوش عالم فاضل حاضر دماغ ذہین سنجیدہ اور خوش گفتار ہیں۔وہ شکل وشباہت کے لحاظ سے وجیہہ ورُعب دار ہیں تاہم وہ مجموعی طور پر ایک پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔

ان کی ذہانت اور خداداد صلاحیت نے انہیں بلند مقام عطا کیا۔ان کی علمی قامت کا اندازہ ان کی گفتگو سے ہوتا ہے۔ مزید مطالعہ نے انہیں اور سچا انسان بنا دیا۔جس سے ان کی گفتگو معاشرتی اور گردوپیش کے انداز سے ہٹ کر عالمانہ اور فاضلانہ ہوتی ہے۔

یہی عامر بن علی جب ادبی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں وہ جس صنف کو بھی خیال کر کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔اس کو کلاسکی روایت سے جوڑ کر پھر اپنی شاعرانہ عظمت سے اس میں گوناگوں تجربہ کر کے اسے جدت رنگینی اور تفرع عطا کرتے ہیں۔

انہوں نے اُردو ادب کی صنف غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کی۔ پھر شاعری کی دیگر اصناف نظم اور ہائیکو میں تجربات بھی کیے۔

غزل میں وہ ایک منفرد لب ولہجہ اور منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔روایتی مضامین میں نیا خون دوڑا کر غزل کو نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ پرانے موضوعات سے استفادہ کے ساتھ ساتھ جدید موضوعات مثلاً اخلاق ومذہب کا رومانی،نفسیاتی، سیاسی اور عصری موضوعات میں اظہارِ خیال کے نئے قرینے تراشے ہیں۔

اپنا شاعرانہ تشخص برقرار رکھتے ہوئے اسلوب وادا کی انفرادی سب سے الگ شناخت بنائی ہے انہوں نے اپنی غزل میں تغزل کا دامن ہاتھ میں رکھتے ہوئے معاشرتی اور سیاسی جبر کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

مظلوم عوام اور ظالم حکمرانوں کے حالات پر آنسو بہائے ہیں۔معاشی اور اقتصادی نظام کی خرابیاں زیادہ بیان کی ہیں۔غزل میں ان کی آواز غریبوں ، بے کسوں اور بے بسوں کی آہ معلوم ہوتی ہے۔ان کی غزل میں ان کی ذاتی زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔انہیں اپنی زندگی کی مایوسیوں اور پریشانیوں کا احساس رہتا ہے۔شاید اسی احساس نے ان کے کلام میں تلخی جلنے،کڑھنے اور ناراضی کا انداز پیدا کیا ہے۔

ان کی غزل میں جمالیات کا پہلو بہت کم ملتا ہے اور وہ بھی انفرادیت اور انوکھے رنگ میں محبوب کے جمال کا سراپہ

کھینچتے ہیں۔ان کی غزل میں زبان ذاتی ندرت لسانی معنوی جدت تراکیب محاورات تشبیہات واستعارات، ایمائیت اشاریت، رمزیت اورنکھرے وسنورے الفاظ ان کی غزل کومنفرد اسلوب عطا کرتے ہیں۔

ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اصلی جوہر ان کی نظموں میں کھلتے ہیں۔ان کی نظمیں متنوع موضوعات کی حامل ہیں کسی نظم میں قومی اور ملی شخصیات سے والہانہ لگاؤ کا بیان ہے تو کسی نظم میں وطن کے پرستار کا روپ دھار لیتے ہیں۔

ان کی نظم کا اپنا ذائقہ ہے اور غزل کا اپنا۔ جہاں ان کی غزلیں زیادہ جاندار نظر آتی ہیں وہاں ان کی نظموں کا بھی رنگ جدا ہے۔ وہ ظلم و جبر ناانصافیوں کے خلاف ایک صدا بلند کرتے ہیں اور حق گوئی سے گھبراتے ہیں۔ وہ مظلوم کی آواز اپنی شاعری کے ذریعے بلند کرتے ہیں ان کی شاعری میں درد سا پایا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سے قاری کے دکھوں کو زبان ملتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے گویا وہ دکھوں کی دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ان کی شعری زبان سادہ اور عام فہم ہے۔اشعار میں تکلف نہیں بلکہ روانی ہی روانی ہے۔انہوں نے چھوٹی بحور میں بھی اشعار کہے اور بڑی بحروں میں بھی۔کبھی وہ اپنے خیالات چند مصرعوں میں بیان کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو کبھی احساسات وجذبات کے اظہار کے لیے نثری نظم لکھتے ہیں۔

انہوں نے اپنی شاعری میں فنی خوبیوں کو مدنظر رکھا ہے وہ اپنی شاعری میں تشبیہات واستعارات اور نادر تراکیب سے بھی رنگ بھرتے ہیں۔استفہامیہ انداز خود کلامی کا عنصر بھی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔کبھی تو وہ خود سے کلام کرتے نظر آتے ہیں۔تو کبھی خدا سے مخاطب ہونے کی جرأت کرتے ہیں اور گلے شکوے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی شاعری عصرِ حاضر کی معاشی، معاشرتی، سیاسی وسماجی اور اخلاقی صورتِ حال کی عکاس ہے جو کچھ معاشرے میں دیکھتا ہے۔اسے محسوس کر کے شاعری کے ذریعے بیان کیا ہے۔

عامر بن علی نے اپنے افکار کی توضیح وتشریح نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے ان کی شاعری قدیم اور جدید نظریات کا ملاپ نظر آتی ہے۔

# مصادر و مراجع

## بنیادی مآخذ


۱۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، لاہور: المطبۃ العربیۃ پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۴ء

۲۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۰ء

۳۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۱ء

۴۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۵ء


## ثانوی مآخذ


۱۔ ادیب، مسعود حسن، سید، رضوی، ہماری شاعری، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء

۲۔ ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی ہیئتی اور عروضی سفر، لاہور: مجلسِ ترقی ادب اردو، ۲۰۰۸ء

۳۔ افتخار شفیع، اصناف شاعری، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۱ء

۴۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۲ء

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع پنجم ۲۰۰۶ء

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، غزل کے رنگ، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۹ء

۷۔ انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقاء، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء

۸۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۲ء

۹۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

۱۰۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۱۱۔ زکریا، ڈاکٹر خواجہ، انتخاب زریں اردو غزل، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۸ء

۱۲۔ سحاب، منصف خان، نگارستان، لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۰ء

۱۳۔ سعد اللہ کلیم، ڈاکٹر، اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، جلد اوّل، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء

۱۴۔ سلام سندیلوی، ادب کا تنقیدی مطالعہ، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، س ن

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان شاعرات: تخلیق خدوخال، مقدمہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۱۷۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، لاہور: شعبہ اردو، جی۔سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء

۱۸۔ شمس قیس رازی، العجم فی معائر اشعار العجم، تہران: دانش گاہ، س ن

۱۹۔ صہبائی، امام بخش، حدائق البلاغت، (ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر مزمل حسین)، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء

۲۰۔ عابد علی عابد، سید، اصولِ انتقاد ادبیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

۲۱۔ عابد، سید عابد علی، البیان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۲۲۔ عارف حسن خان، تلخیص بحر الفصاحت، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۶ء

۲۳۔ عبدالقادر سروری، اُردو مثنوی کا ارتقاء، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۴۴ء

۲۴۔ غالبؔ، اسداللہ، مرزا، کلیاتِ غالب، لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء

۲۵۔ غالب، اسداللہ خان، دیوان غالب، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اگست ۲۰۱۴ء

۲۶۔ غلام حسین ذوالفقار، اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر، لاہور: مطبع جامعہ پنجاب، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء

۲۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

۲۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو غزل کی شعری روایت، کراچی: حلقہ نیاز ونگار، ۱۹۹۵ء

۲۹۔ قمر نقوی، اُردو شاعری کی آخری کتاب، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء

۳۰۔ کوثر، سعید الدین، مولانا، مخزن بلاغت، پشاور: کتب خانہ الضاریہ، س ن

۳۱۔ گوپی چند نارنگ، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۳۲۔ محمد افتخار شفیع، اصنافِ شاعری، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۱ء

۳۳۔ محمد حسین آزاد، مولانا، آبِ حیات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء

۳۴۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، ادبی مطالعات، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء

۳۵۔ مظفر عباس، اُردو میں قومی شاعری، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۸ء

۳۶۔ ناہید کوثر، ڈاکٹر، اردو شاعری کا ارتقاء، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء

۳۷۔ نجم الغنی رام پوری، بحر الفصاحت (جلد اوّل)، مرتب: سید قدرت نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب

۳۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۱۳ء

۳۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۴ء

۴۰۔ یوسف حسین خاں، اردو غزل (جلد اوّل)، لاہور: القمر انٹر پرائزز، س ن


## رسائل وجرائد


۱۔ فراق مضمون، غزل کیا ہے؟، لاہور: شاہکار شمارہ ۴، ۱۹۹۲ء

## لغات


۱۔ احمد دہلوی، سیّد، مولوی، (مرتبہ) فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم، چہارم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۲۔ درسی اُردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (طبع دوم)، ۲۰۰۴ء

۳۔ ذوالفقار احمد تابش، اعجاز اللغات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۴۔ سعد حسن خاں، مولانا و دیگر، مترجمین: المنجد، کراچی: دارالاشاعت، یازدہم ۱۹۹۴ء

۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو لغت تاریخی اصولوں پر، کراچی: اردو لغت بورڈ، جلد ہشتم، ۱۹۹۱ء

۶۔ فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۷ء

۷۔ مولوی سید تصدق حسین رضوی، (مرتبہ)، لغات کشوری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س ن

۸۔ مولوی نور الحسن، (مرتب)، نور اللغات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، (جلد سوم)، ۱۹۸۹ء


## انٹرویو


۱۔ عامر بن علی، مکالمہ از راقم، میاں چنوں، ۲۹ جولائی ۲۰۱۸ء

# فہرست ابواب


| | |
|---|---|
| باب اوّل: عامر بن علی ـــ سوانح و شخصیت | ۱ |
| باب دوم: عامر بن علی کی غزل گوئی کا فکری و فنی جائزہ | ۱۶ |
| باب سوم: عامر بن علی کی نظم گوئی کا فکری و فنی جائزہ | ۸۸ |
| باب چہارم: عامر بن علی کا ہم عصر شعرأ میں ادبی مقام و مرتبہ | ۱۵۳ |
| ماحصل | ۱۶۶ |
| مصادر و مراجع | ۱۶۹ |

# تفصیل ابواب


باب اوّل: عامر بن علی ـــ سوانح و شخصیت ۱

ولادت ۲

اصل نام اور قلمی نام ۳

تعلیم ۳

فکر معاش ۴

ازدواجی زندگی ۴

خاندانی پس منظر ۴

ادبی سفر ۵

شخصیت ۵

تصانیف ۷

باب دوم: عامر بن علی کی غزل گوئی کا فکری و فنی جائزہ ۱۶

غزل کا آغاز و ارتقا ۱۷

عامر بن علی کی غزل گوئی کا فکری جائزہ ۳۰

| | |
|---|---|
| عامر بن علی کی غزل گوئی کا فنی جائزہ | ۵۹ |
| باب سوم: عامر بن علی کی نظم گوئی کا فکری وفنی جائزہ | ۸۸ |
| نظم کا آغاز وارتقا | ۸۹ |
| عامر بن علی کی نظم گوئی کا فکری جائزہ | ۱۰۰ |
| عامر بن علی کی نظم گوئی کا فنی جائزہ | ۱۲۱ |
| باب چہارم: عامر بن علی کا ہم عصر شعرا میں ادبی مقام ومرتبہ | ۱۵۳ |
| ماحصل | ۱۶۶ |
| مصادر ومراجع | ۱۶۹ |

# مقدمہ

سب سے پہلے تعریف اُس پاک اور بابرکت ذات کی جس نے مجھے انسان بنایا اور تحقیق و جستجو کا شعور میرے اندر پیدا کیا۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس کے خصوصی کرم ہی کی بدولت مقالے کی تکمیل ہوسکی۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی کرم فرمائی کی وجہ سے دورانِ مقالہ، متعدد مشکلات و مصائب آسانیوں میں بدلتے گئے اور یوں مقالے کے تکمیلی مراحل سہل ہو گئے۔

## موضوع کا تعارف

تحقیق ایک ایسا راستہ ہے کہ جس پر چل کر انسان علوم کی منازل کو طے کر رہا ہے۔ شاعر اپنے عہد کے نمائندہ ہوتے ہیں وہ اپنی شاعری میں معاشرے کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ میاں چنوں ایک ایسی زرخیز سرزمین ہے کہ جہاں پر ادب کے بہت سارے سایہ دار درخت پروان چڑے۔ عامر بن علی اپنے خطے کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں اپنا نام متعارف کروایا۔ انہوں نے نہ صرف غزل بلکہ نظم میں بھی طبع آزمائی کی اور خوب نام کمایا۔ عامر بن علی نظم، غزل اور ہائیکو کے میدان میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے کئی ایک تجربات کرتے نظر آتے ہیں۔ اب تک عامر بن علی کی تصانیف کی تفصیل کچھ یوں ہے:

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ یاد نہ آئے کوئی | (شعری مجموعہ) | ۱۹۹۸ء |
| ۲۔ سرگوشیاں | (شعری مجموعہ) | اشاعت پنجم ۲۰۱۰ء |
| ۳۔ محبت چھو گئی دل کو | (شعری مجموعہ) | اشاعت سوم ۲۰۱۱ء |
| ۴۔ چلو اقرار کرتے ہیں | (شعری مجموعہ) | اشاعت دوم ۲۰۰۴ء |
| ۵۔ جہاں گردی | (سفرنامہ) | ۲۰۱۷ء |
| ۶۔ آج کا جاپان | (سفرنامہ) | اشاعت دوم ۲۰۱۴ء |
| ۷۔ گفتگو | (انٹرویوز) | اشاعت اول ۲۰۱۲ء |

سات تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی تصانیف میں ''یاد نہ آئے کوئی'' ''سرگوشیاں'' ''محبت چھو گئی دل کو''

''چلواقرار کرتے ہیں'' کا راقم نے''عامر بن علی کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ''پیش کیا ہے۔

## اہمیت موضوع

عامر بن علی ایک باکمال اور عمدہ شاعر ہیں جو اپنی شاعری میں خوب تجربات کرتے نظر آتے ہیں۔وہ اسلوب کے حوالے سے ایک خاص مہارت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں بہت سارے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ان کی شاعری کی تفہیم وتحسین کرنا اردو ادب میں ایک باب روشن کا مترادف ہے۔عامر بن علی جیسے شاعر کو منظرِ عام پر لانے کے لیے یہ مقالہ ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔

## سبب انتخاب

شاعری سے میں بہت لگاؤ رکھتا ہوں۔اس سلسہ میں میں نے اردو شعراء کو پڑھ رکھا ہے۔عامر بن علی کی تصانیف میری نظر سے گزری اور مجھے ان کی شاعری بہت پسند آئی۔عامر بن علی کی شاعری پر پہلے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا تو راقم نے سوچا کہ ان کی شاعری پر تحقیقی کام ہونا چاہیے۔راقم نے''عامر بن علی کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ''موضوع کے طور پر لے کر اس پر تحقیقی کام کیا۔

## مقاصد تحقیق

عامر بن علی ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ان کی شاعری میں بہت سارے موضوعات سموئے ہوئے ہیں۔ نہ صرف غزل بلکہ وہ نظم کے ساتھ ساتھ ہائیکو میں بھی خاص مہارت رکھتے ہیں۔تاہم عامر بن علی جیسے شاعر کی شاعری پر تحقیقی کام کرنا ان کے فن کو منظرِ عام پر لانے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے تاکہ ان کی شاعری سے ملنے والے موضوعات سے آنے والے محققین کو فائدہ حاصل ہو۔

## سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ

عامر بن علی کی شاعری پر اب تک جو تحقیقی کام ہوا وہ صرف رسائل میں چھپتا رہا۔اس سلسہ میں مختلف ناقدین نے ان کی شاعری پر کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین میں ان کی نظموں،غزلوں اور ہائیکو پر اپنا جائزہ پیش کیا۔عامر بن علی کی شاعری پر چونکہ کوئی باقاعدہ تحقیقی کام نہ ہوسکا اس لیے راقم نے''عامر بن علی کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ''تحقیقی مقالہ کے موضوع کے طور پر لیا اور اس پر کام کیا۔

## بنیادی ماخذ ومراجع

راقم نے اس مقالہ میں عامر بن علی کے چار شعری مجموعوں کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔جن کے نام درج ذیل ہیں۔

ا۔ یاد نہ آئے کوئی

ب۔ سرگوشیاں

ج۔ محبت چھوگئی دل کو

د۔ چلو اقرار کرتے ہیں

## منہج تحقیق

ا۔ زیر تحقیق مقالہ بیانیہ منہج تحقیق پر مبنی ہے۔

۲۔ مقالہ تحریر کرتے وقت، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد کے منظور کردہ اسلوبِ تحقیق کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۳۔ ہر باب کے آخر پر حوالہ جات دیے گئے ہیں اور ممکن حد تک کوشش کی گئی ہے کہ اصل مصادر ومراجع سے رجوع کیا جائے تاہم ناگزیر ضرورت کے تحت مختلف کتب یعنی ثانوی مآخذ بھی بروئے کار لائے گئے ہیں۔

## تبویب

راقم نے اس مقالہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا۔ پہلے باب میں ''عامر بن علی کے احوال وآثار'' کے متعلق لکھا گیا جس عامر بن علی کی خاندانی پس منظر، بچپن، نام، تخلص، تعلیم وتربیت، شادی اور ازدواجی زندگی، علمی وشعری زندگی کا آغاز اور دوست احباب کی رائے دی گئی۔

دوسرے باب میں ''عامر بن علی کی غزل کا فکری وفنی جائزہ'' غزل کے آغاز وارتقا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ عامر بن علی کی غزل گوئی پر خصوصی تجزیہ پیش کیا گیا۔

تیسرے باب میں ''عامر بن علی کی نظم کا فکری وفنی جائزہ'' نظم کی روایت اور مفاہیم کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خصوصی حوالے سے عامر بن علی کی نظم گوئی کا فنی وفکری جائزہ لیا گیا۔

## تشکر

میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس کے خصوصی کرم ہی کی بدولت مقالے کی تکمیل ہوسکی۔ مقالے کی تکمیل کے حوالے سے میں اپنی قابلِ قدر اور نہایت شفیق استاد ڈاکٹر رابعہ سرفراز صاحبہ کا شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میرے اس تحقیقی سفر میں میری مدد اور راہنمائی فرمائی۔ انہوں نے ہمہ وقت میرے حوصلے کو بڑھائے رکھا اور قدم قدم پر میری تخلیقی صلاحیتوں کو بڑھاتے رہے۔

میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کے صدرِ شعبہ جناب ڈاکٹر آصف اعوان اور دیگر اساتذہ کرام میں ڈاکٹر سعید احمد، ڈاکٹر شبیر احمد قادری اور ڈاکٹر طارق ہاشمی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری راہنمائی فرمائی۔ میں اپنے والدین کا احسان مند ہوں جن کی دعاؤں سے میں آج اس مقام پر ہوں۔

اپنے بھائیوں جناب محمد نوید، عبدالغفار اور امتیاز کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میرے اس تعلیمی سفر میں میری ہر ممکن معاونت کی۔ دوست احباب میں خصوصاً محمد افضل سعید، عبدالرشید جامی اور پرنسپل سپیریئر کالج پروفیسر شفیق الرحمٰن کا شکر گزار ہوں جو اپنی تمام مصروفیات کے باوجود میرے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ دیگر احباب میں ارشد اچھی بھائی، پیر سید ہدایت رسول شاہ، سیف اللہ، عطاء النور جامی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے ساتھ اس تحقیقی مقالہ پر تعاون کیا۔

میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے لائبریرین جناب رانا صام وکیل بھائی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے کتابوں تک میری رسائی ممکن بنائی۔ عامر بن علی صاحب کا بہت شکر گزار ہوں جب اُن کی ضرورت پڑی تو انہوں نے ہر طرح سے میری مدد اور راہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے جان و مال میں برکت فرمائے۔ آمین!

عبدالحفیظ کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے نہایت قلیل وقت میں میرے اس تحقیقی مقالے کو کمپوز کیا اور میرے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ میں نے اس موضوع سے انصاف کرنے کی بساط بھر کوشش کی ہے۔ امید واثق ہے کہ ارباب علم و دانش میری اس کوشش کو سراہیں گے اور میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ شکریہ

ساجد علی

باب اوّل

# عامر بن علی ـــــ سوانح و شخصیت

## باب اوّل

# عامر بن علی ___ سوانح و شخصیت

انسانی تہذیب کے کسی عہد کو سمجھنے کے لیے ادب ایک معتبر مآخذ ہے۔ ادب کا طریق کار تاریخ اور سماجی علوم سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ تخلیق کار نہ تو اپنے عہد کی تاریخ لکھتا ہے اور نہ سماجی و سیاسی واقعات اور معاملات کا معروضی تجزیہ کرتا ہے۔ وہ تو اپنے طرزِ احساس کو اپنے وجدان سے چھوتا ہے۔ انسانی احساسات و جذبات کی کائنات کی سیر کرتا ہے۔ زمان و مکان کے معاملے کو اپنی تخلیقی آنکھ سے دیکھتا ہے اور پھر اسے یوں بیان کرتا ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی معلوم ہونے لگے۔

کسی بھی شاعر و ادیب کے تخلیقی اور فنی سفر کو اس وقت تک پوری طرح سمجھنا ممکن نہیں جب تک ہم اس کے گرد و پیش کی دنیا کو اپنے دھیان میں نہ رکھیں۔ خاص طور پر وہ سماجی اور تہذیبی حالات جن میں لکھنے والے کی زندگی کے ابتدائی ایام گزرے۔ وہ حوادثِ زمانہ جنھوں نے تخلیق کار کی پرورش میں اہم حصہ لیا۔ شخصیت کی تکمیل و تشکیل میں وراثت میں ملنے والے عضویاتی اور نفسیاتی امکانات ماحول کے سازگار عوامل کے ساتھ مل کر حصہ لیتے ہیں۔ بچپن کا ماحول، وہ لوگ جن میں بچپن گزرا ہو، تاحیات فرد کی شخصیت پر اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں۔ عامر بن علی کی فنی و تخلیقی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس ابتدائی ماحول اور فضا کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا جن میں ان کا بچپن اور زندگی کے تمام مراحل گزرے۔

ملتان، دریائے چناب اور دریائے راوی کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہی سرسبز و شاداب اور خوشحالی کا گہوارہ رہا۔ یہاں کے پُرامن باشندے مظاہرِ فطرت اور فنونِ لطیفہ سے پیار کرنے والے تھے۔ ملتان جو ایک منفرد اور نمایاں حیثیت کا مالک خطہ ہے۔ جہاں سے ہمیشہ ہی امن و محبت اور علم و فن کے سرچشمے جاری ہوئے۔ یہاں آج بہت سی ہستیاں آسودہ خاک ہیں اور تہہ خاک بھی ان کا فیض جاری و ساری ہے۔ ان ہی ہستیوں میں سے ایک حضرت بہاوالدین زکریاؒ ہیں جن کے فیضان نظر سے ڈاکو سے درویش بننے والے صوفی بزرگ میاں چنوںؒ ہیں جن کی رحلت کے بعد وہ علاقہ ان کے ہی نام سے منسوب ہوا اور آج ''میاں چنوں'' کہلاتا ہے۔

### ولادت

عامر بن علی اپنی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

''میری پیدائش یکم جنوری ۱۹۷۸ء کوجنوبی پنجاب کی تحصیل میاں چنوں میں ہوئی۔''(۱)

## اصل نام اور قلمی نام

عامر بن علی کا اصل نام رانا عامر حسین ہے۔ایک سوال کے جواب میں بتاتے ہیں:

''میرا اصل نام رانا عامر حسین ہے۔اور میرا قلمی نام عامر بن علی ہے۔یہ نام میں نے کالج کے فرسٹ ائیر میں اس وقت اختیار کیا جب مجھے کالج کے ادبی میگزین کا سب ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔''(۲)

## تعلیم

عامر بن علی نے ابتدائی تعلیم تحصیل میان چنوں ہی سے حاصل کی۔پنجم کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول میں کلاس ششم میں داخلہ مل گیا۔اور میٹرک کا امتحان ملتان بورڈ سے دیا اور امتیازی نمبرز حاصل کیے اور اسی بنیاد پر گھر والوں نے آپ کو ڈاکٹر بنانے کا فیصلہ کیا۔اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ میاں چنوں سے لاہور آ گئے۔ایف ایس سی میں داخلے کے کچھ ہی دنوں بعد گورنمنٹ کالج آف سائنس لاہور کے ادبی پرچے ''دبستان'' کے نائب مدیر بنے۔اسی حوالے سے آپ ایک سوال کے جواب میں بتاتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ کالج کے میگزین کا نائب مدیر بننا میرے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ڈاکٹر علی محمد خان، جو کہ بلند پایہ ادیب ہیں ''دبستان'' کے انچارج تھے،ان ست بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔علاوہ ازیں مجلس اقبال کا جنرل سیکرٹری بھی منتخب ہوا۔جب مجھے سرکاری میڈیکل کالج میں داخلے کے نمبر نہ ملے تو میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور جو کہ اب یونیورسٹی ہے یہاں سے بہت سینیئر ادیبوں سے سیکھنے کا موقعہ ملا۔''(۳)

عامر بن علی کا ادبی سفر ایف ایس سی سے شروع ہوا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی کے سلسلے میں گئے تو وہاں کالج گزٹ اور صوفی تبسم کے علاوہ مجلس اقبال سے بھی منسلک ہو گئے۔ایم بی اے میں کالج میگزین EVESDROPPER

کے نہ صرف ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر رہے بلکہ اردو حصہ شروع کروانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

## فکر معاش

عامر بن علی اپنی عملی زندگی کے بارے میں کچھ یوں بتاتے ہیں:

''اصل میں چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ بڑے بھائی بیرون ملک مقیم تھے اور جاپانی گاڑیوں کی ایکسپورٹ سے متعلق کاروبار کرتے تھے۔ جیسے ہی میں ایم بی اے مکمل کیا، چند ماہ بعد میں نے کاروبار جوائن کرلیا۔ سب سے پہلے میں لاطینی امریکہ گیا، چند سال چلی میں رہا اور پھر جاپان آ گیا۔ اب بھی میں مختلف ممالک کا سفر کاروباری سلسلے میں کرتا رہتا ہوں لیکن زیادہ تر وقت جاپان میں گزرتا ہے۔''(۴)

## ازدواجی زندگی

عامر بن علی ۲۰۰۰ء کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ عامر بن علی اپنی شادی کے بارے میں ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

''۲۰۰۰ء کو میری شادی اپنے خاندان ہی میں میری والدہ محترمہ کی مرضی سے طے پائی۔ اب تو خدا نے ہمیں تین بیٹوں سے نوازا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ حسنین علی محمد

۲۔ سلمان علی

۳۔ عمار علی''(۵)

## خاندانی پس منظر

آپ کی والدہ ایک نیک صفت خاتون اور عبادت گزار تھیں انھوں نے گلی محلے کے بچے، بچیوں کو فی سبیل اللہ قرآن پاک پڑھایا ان کے وفات کے بعد قرآنی درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ عامر بن علی اس حوالے سے بتاتے ہیں:

''میری والدہ محترمہ کی وفات ۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ہوئی ان کے بعد بھی ہم نے ان کے

مشن کو جاری رکھتے ہوئے ''راوی اسلامک سنٹر'' کے نام سے ادارہ چلا رہے ہیں''(۶)

آپ کے گھرانے کا سیاست کے ساتھ گہرا رشتہ منسلک ہے۔آپ کے بڑے بھائی مسلسل تیسری بار میاں چنوں پارلیمان کے رکن منتخب ہوئے ہیں۔

## ادبی سفر

عامر بن علی کا ادبی سفر تو انٹر سے شروع ہو چکا تھا مختلف ادبی میگزین کے ایڈیٹوریل بورڈز میں اپنی خدمات سرانجام دیں اور دوران تعلیم ہی کتابوں کی اشاعت ہونے لگی۔آپ اس حوالے سے تفصیل سے بتاتے ہیں:

''گریجوایشن کا طالب علم تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور کے نیو ہوسٹل میں مقیم تھا جن دنوں میں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''یاد نہ آئے کوئی'' ترتیب دیا۔اس کی اشاعت ۱۹۹۸ء میں ہوئی جب میں MBA میں پڑھ رہا تھا زمانہ طالب علمی میں ہی اگلا شعری مجموعہ ''سرگوشیاں'' کے نام سے شائع ہوا۔اب تک چار شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔پڑھائی مکمل کرتے ہی ''ماہنامہ ارژنگ'' کے نام سے ایک ادبی پرچہ دوستوں کے ساتھ مل کر شائع کرنا شروع کیا جو کہ ۱۹ویں سال میں ہے اسی سلسلے میں مختلف مشاہیر کے انٹرویو کیے وہ ''گفتگو'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔لاطینی امریکہ میں قیام کے سبب مجھے ہسپانوی زبان پر بھی دسترس حاصل ہوئی میں نے نوبیل انعام یافتہ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری کا ہسپانوی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو کہ ''محبت کے دو رنگ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔دو سفر نامے ''آج کا جاپان'' اور ''جہاں گردی'' کے عنوان سے شائع ہوئے اور تیسرا ''گرد سفر'' زیر طبع ہے۔اخباری کالموں کا مجموعہ ''مکتوبات جاپان'' بھی زیر ترتیب ہے۔باقی کچھ جاپانی شعرا کے تراجم کر رہا ہوں۔''(۷)

## شخصیت

شخصیت کی ایک جامع تعریف کرنا بہت مشکل کام ہے۔سادہ الفاظ میں ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کسی انسان کی شخصیت

اس کی ظاہری و باطنی اور اکتسابی خصوصیات (Personality Attributes) کا مجموعہ ہے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ تمہارے دوست کی شخصیت کیسی ہے تو ہم جواب میں فوراً اس کی چند صفات کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ محنتی، وقت کا پابند، ذہین اور مخلص ہے۔

ان میں سے بہت سی خصوصیات مستقل ہوتی ہیں لیکن طویل عرصے کے دوران میں تبدیلیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں اور انہی خصوصیات کی بنیاد پر ایک شخص دوسرے سے مختلف نظر آتا ہے اور ہر معاملے میں دوسروں سے مختلف رویے اور کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر کسی شخصیت کو درست طور پر جان لیا جائے تو پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ فرد مخصوص حالات میں کیا کرے گا۔ ان میں سے بعض صفات عارضی حالات کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کی یہ خصوصیات بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں ایک تو وہ ہیں جو اسے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں یہ غیر اکتسابی یا قدرتی صفات کہلاتی ہیں۔ دوسری وہ خصوصیات ہیں جنہیں انسان اپنے اندر یا تو خود پیدا کرسکتا ہے یا پھر اپنی قدرتی صفات میں کچھ تبدیلیاں پیدا کر کے انہیں حاصل کرسکتا ہے یا پھر یہ اس کے ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں یہ اکتسابی خصوصیات کہلاتی ہے۔ قدرتی صفات میں ہمارا رنگ، نسل، شکل وصورت، جسمانی ساخت ذہنی صلاحیتیں وغیرہ شامل ہیں جبکہ اکتسابی صفات میں انسان کی علمی سطح، اس کا پیشہ، اس کی فکر وغیرہ شامل ہیں۔

انسان کی شخصیت کے دو پہلو ہیں ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن۔ انسان کا ظاہر وہ ہے جو دوسرے لوگوں کو واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس میں اس کی ظاہری شباہت اور رویے شامل ہیں۔ باطن میں انسان کی عقل، علم، جذبات اور احساسات اور رجحانات شامل ہیں۔ عام طور پر انسانوں کا ظاہر ان کے باطن کا ہی عکس ہوتا ہے البتہ بعض افراد عارضی طور پر اپنے باطن پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔

شخصیت ہی انسان کی اصل پہچان ہوتی ہے۔ اسی میں ہم انسان کا رہن سہن اور طور طریقے کو دیکھتے ہیں اور فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انسان کس قسم کی شخصیت رکھتا ہے۔ عامر بن علی ایک باوقار شخص پرکشش اور بارونق انسان ہے۔ لوگوں سے ملتے وقت ان کے چہرے پر ہمیشہ ہلکی مسکراہٹ چہکتی رہتی ہے۔ عامر بن علی ایک باوقار شخص ہے جنہوں نے اپنی علمی سطح اور بلند اخلاق کی بدولت معاشرے میں اپنا مقام بنایا۔ انہوں نے اپنی کم عمری میں اتنا کچھ پڑھ رکھا ہے۔ ایسا کوئی کوئی شخص ہی کرسکتا ہے۔ اتنا کچھ پڑھ لینے کے باوجود وہ اپنی کم علمی کے معترف ہیں۔ علم پر غرور نہیں کرتے اور نہ کبھی کسی دوسرے کو علم کی بنا پر نیچا دِکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ بڑے عاجز اور درویش صفت انسان ہیں۔ انسان کی شخصیت میں اہم ترین عنصر اس کی عادات

ہوتی ہیں۔ یا وہ رویے کہ جن کے تحت وہ دوسروں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے وہ بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح حالات کے ساتھ رویوں میں تبدیلی آسکتی ہے۔ وہی انسان کامیاب ہوتا ہے جو کہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلنے کی بجائے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ حالات کا رونا رونے کی بجائے ان کو ہمت و محنت کے ساتھ برداشت کرے۔

عامر بن علی بھی ایسے شخص ہے جو کہ محنت و کوشش کو اپنا شعار سمجھتے ہیں۔ وہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کا رونا رونے کی بجائے ہمت سے کام لیتے ہیں۔ دوست احباب کے ساتھ ان کا تعلق بہت ہی اچھا ہے۔ اور خوش اخلاق رویہ رکھتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ نہایت بے تکلّفانہ رویہ رکھتے ہیں۔ محافل اور تحریکوں میں تشریف لے جاتے ہیں۔ عامر بن علی جو کہ حد درجہ انکسار پسند انسان ہیں۔ جو ان کے پاس موجود ہے اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ دنیاوی چیزوں کا حرص و لالچ نہیں کرتے ہیں۔ اچھے اخلاق کے مالک ہیں۔ بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ بہت پیار اور محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ کبھی بھی کسی کو گالی نہیں دی۔ اگر کوئی ایک وقت میں ان کے ساتھ برا سلوک کر بھی لے تو اس کو معاف کر دیتے ہیں۔ بدلہ نہیں لیتے۔ سچ بولنا ان کی وصف میں شامل ہے۔ سچ بولنے سے کبھی نہیں گھبراتے ہیں۔ جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ لوگوں کی عزت کرنا ان کے وصف میں شامل ہے۔ کسی کی عزت اس لیے نہیں کرتے کہ وہ بھی ان کی عزت اور احترام بدلے میں زیادہ کرے گا بلکہ دل سے ان کی عزت کرتے ہیں۔ عامر بن علی ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکردار انسان بھی ہے۔ وہ اچھے شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتے ہیں۔ مہمان نوازی ان کو بہت پسند ہے۔ جو کوئی بھی ان کے پاس مہمان آجائے تو اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں اور شکایت کا موقع نہیں دیتے ہیں۔ مہمان کو اپنے لیے باعثِ رحمت سمجھتے ہیں۔ عامر بن علی ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی محفل میں بیٹھ کر انسان خود کو محترم سمجھنے لگتا ہے۔ دوست احباب سب جس سے بھی آپ کے بارے میں پوچھا گیا تو سب نے تعریف کی اور آپ کے اچھے اخلاق کی گواہی دی۔ آپ ایک ہمدرد اور ملنسار انسان ہیں۔ ان سے مل کر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں بہت پہلے سے جانتے ہیں اور رشتہ کافی گہرا ہے دوستی کا۔

## تصانیف

عامر بن علی کی تصانیف کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ) ۱۹۹۸ء

| | | |
|---|---|---|
| ۲۔سرگوشیاں | (شعری مجموعہ) | اشاعت پنجم ۲۰۱۰ء |
| ۳۔محبت چھوگئی دل کو | (شعری مجموعہ) | اشاعت سوم ۲۰۱۱ء |
| ۴۔چلو اقرار کرتے ہیں | (شعری مجموعہ) | اشاعت دوم ۲۰۰۴ء |
| ۵۔جہاں گردی | (سفرنامہ) | ۲۰۱۷ء |
| ۶۔آج کا جاپان | (سفرنامہ) | اشاعت دوم ۲۰۱۴ء |
| ۷۔گفتگو | (انٹرویوز) | اشاعت اول ۲۰۱۲ء |

## ۱۔یاد نہ آئے کوئی

آپ کا یہ شعری مجموعہ ''یاد نہ آئے کوئی'' ۲۰۱۵ء میں اشاعت دوم نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔اس کتاب پر شہرت بخاری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔شہرت بخاری لکھتے ہیں:

> ''عامر بن علی ایک ہی نام ہے۔۔۔۔انھوں نے نہ صرف یہ کہ نظم سے اپنے شعری زندگی کا آغاز کیا بلکہ اتنا کہا کہ یہ مجموعہ بن گیا۔اس کم عمری میں مجموعہ بنالینا بھی آسان کام نہیں تھا۔''یاد نہ آئے کوئی'' ان کے شوق کی فراوانی کی گواہی ہے۔سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علمی کے زمانے ہی میں مجموعہ تیار کرسکتا ہے تو میری عمر تک پہنچتے پہنچتے کتنے مجموعے تیار کرلے گا۔یہ مجموعہ نئی نظموں کا نمونہ ہے۔اس کی نظم جدید نظم کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو کہ ن۔م۔راشد اور میرا جی سے علیحدہ رجحان کا پتہ دے رہی ہے۔بعض اوقات چونکا بھی دے رہی ہے۔''(۸)

## ۲۔محبت چھوگئی دل کو

آپ کا یہ شعری مجموعہ ''محبت چھوگئی دل کو'' ۲۰۰۹ء میں پہلی بار نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔اشاعت دوم ۲۰۱۰ء میں اور اشاعت سوم اگست ۲۰۱۱ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور ہی سے شائع ہوئے۔اس کتاب پر امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔امجد اسلام امجد عامر بن علی کے اس شعری مجموعے کے حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:

''مجھے خوشی ہے کہ وہ میری باتوں کو دھیان سے سنتا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور یوں اس کی شاعری نوجوان نسل کے ساتھ ساتھ ثقہ اور معتبر ادبی حوالوں سے بھی لائقِ توجہ اور پسندیدہ ہوتی جا رہی ہے اسے ملک گیر شہرت اس شعر سے ملی تھی کہ

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

زیرِ نظر مجموعے میں آپ کو اس جیسے کئی شعر ملیں گے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس نے ''ہنگامی'' اور ''پائدار'' کے درمیانی فرق کو اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے اور اب اس رستے پر رواں دواں ہے جہاں ''جاودانی'' اس کے انتظار میں ہے۔''(۹)

عطاء الحق قاسمی عامر بن علی کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ نظمیں اور غزلیں اس نے وہاں راتوں کو جاگ جاگ کر لکھی ہوتی ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ جگراتے کبھی ضائع نہیں جایا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مقبولیت اور پذیرائی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ عامر بن علی، بہت ملنسار، ہنس مکھ اور محبتیں بانٹنے والا شاعر ہے۔ نفرت اور منافقت سے آلودہ اور موجودہ ادبی فضا میں ایسے شاعروں کا وجود غنیمت ہے جو نہ صرف شاعری میں پیار اور محبت کی بات کرتے ہیں بلکہ خود اس کی عملی تصویر بھی ہیں۔ عامر بن علی کو شعر سے کمٹمنٹ بہت مبارک ہو۔ میں اس کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔''(۱۰)

## ۳۔ چلو اقرار کرتے ہیں

آپ کا یہ شعری مجموعہ ''چلو اقرار کرتے ہیں'' ۲۰۰۳ء میں پہلی بار المطبعۃ العربیہ لاہور سے شائع ہوا۔ اشاعت دوم ۲۰۰۴ء میں المطبعۃ العربیہ لاہور ہی سے شائع ہوا۔ اس کتاب پر اسلم کولسری نے عامر بن علی کی شاعری کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''عامر بن علی کی شاعری کومل جذبوں کے سادہ اظہار سے عبارت ہے مگر ایسا نہیں ہے

کہ انہوں نے باقی سب کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں۔ وہ کبھی کبھی باہر بھی جھانکتے ہیں، کڑھتے ہیں اور کہیں کہیں ایسا شعر بھی ان کے قلم سے چھلک جاتا ہے جو دنیا اور اہل دنیا پر ایک دردمند تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے، تاہم ایسی صورت میں بھی ایک دبی دبی سسکی کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ دل خراش چیخ کی نہیں۔

عدل پرور بجا ہے عدل تیرا
کیوں یہ گلیوں میں خون بہتا ہے

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

بہر حال ان کا مجموعی رنگ محبت ''نرمی اور ترنم'' مگر شرمیلے پن سے اظہار ہی کا ہے جو قاری کو ایک خاص قسم کے لطف اور سرور سے آشنا کرتا ہے۔ میں عامر بن علی کے تیسرے مجموعہ کلام کی اشاعت پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ شاعری کی یہ رم جھم جاری رہے گی۔ (۱۱)

## ۴۔ سرگوشیاں

آپ کا یہ شعری مجموعہ ''سرگوشیاں'' ۱۹۹۹ء میں پہلی بار نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔ اشاعت دوم ۲۰۰۰ء میں، اشاعت سوم جنوری ۲۰۰۳ء، اشاعت چہارم دسمبر ۲۰۰۵ء اور اشاعت پنجم جولائی ۲۰۱۰ میں نستعلیق مطبوعات لاہور ہی سے شائع ہوئے۔ اس کتاب پر احمد عقیل روبی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ عامر بن علی کے اس شعری مجموعے کے حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:

''سرگوشیاں'' میں بھی کچھ نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جہاں عامر بن علی کی آواز سرگوشیوں کی حد عبور کر کے باہر نکل کر گونجتی ہے مگر اس کا یہ انداز کانوں کو بھلا محسوس نہیں ہوتا۔ ''سرگوشیاں'' عامر کی کچھ غزلوں اور کچھ نظموں کا مجموعہ ہے۔۔۔ سیدھی سادی،

سلیس اور آسان زبان میں کی گئی یہ شاعری ایک ایسے نوجوان کے مشاہدات تازہ تجربات ہیں کو اسے چھوٹی عمر میں حاصل ہوئے ہیں۔ان تجربات اور مشاہدات میں درد وغم کی ٹیس اتنی شدید نہیں کہ پڑھنے والا بلبلا اُٹھے۔آنسوؤں اور آہوں کا طوفان نہیں۔۔۔بلکہ سر اٹھاتی جوانی اور لڑکپن کی آوارہ گردی کی دلچسپیاں اور نادانیاں ہیں۔ایسی نادانیاں اور دلچسپیوں کا ہر لکھنے والا ایک نہ ایک زمانے میں سامنا کرتا ہے۔''(۱۲)

احمد عقیل روبی اپنی بات کا اختتام کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''عامر بن علی کی ''سرگوشیاں'' سے یہ چند سرگوشیاں جو میں پیش کیں،ان سے اندازہ لگانا قطعاً دشوار نہیں کہ اس نوجوان شاعر نے براہ راست اپنے اندر کے احساس کو کتنے خوبصورت پیرائے میں لفظوں کو زبان دی ہے اور کتنے سادہ وسہل مگر دلکش اور واضح طرز اظہار میں اپنی سرگوشیوں کو مکالماتی جرات بخشی ہے.....کتاب پڑھیے اور عامر بن علی کی ''سرگوشیاں'' سنیے۔(۱۳)

## ۵۔جہاں گردی

آپ کا یہ سفر نامہ ''جہاں گردی'' ۲۰۱۷ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔اس کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر امجد پرویز نے انگلش میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔بیک ٹائٹل کے فلیپ پر Daily Times Book Review سے اقتباس نقل کیا گیا ہے۔اس کتاب کا انتساب عامر بن علی کی وطن سے محبت ظاہر کرتی ہے انتساب کچھ یوں ہے:

انتساب

پاکستان کی مٹی

کے نام!

بارش کے بعد جس میں سے

ایسی سوندھی خوشبو اٹھتی ہے
جس کی پوری دنیا میں کوئی مثال نہیں (۱۴)

## ۶۔آج کا جاپان

سفر نامہ ''آج کا جاپان'' ۲۰۱۴ء میں پہلی بار نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا اور جولائی ۲۰۱۷ء میں بھی نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔اس کتاب کے فلیپ پر پروفیسر سویامانے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بیک ٹائٹل کے فلیپ پر خواجہ محمد زکریا کے مضمون سے اقتباس نقل کیا گیا ہے۔اس کتاب کا انتساب عامر بن علی کی اپنی بیٹی سے محبت ظاہر کرتی ہے انتساب کچھ یوں ہے:

انتساب
پیاری بیٹی فاطمہ کے نام!
جو گھر کے تمام بچوں کے لیے ''عینی باجی'' ہیں (۱۵)

پروفیسر سویامانے (استاد شعبہ اردو، اوساکا یونیورسٹی، اوساکا جاپان) لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی کہ اس کے مصنف عامر بن علی صاحب زیادہ وقت جاپان کے ایک ایسے شہر میں رہتے ہیں جہاں ٹوکیو، اوساکا کی طرح غیر ملکی لوگ زیادہ نہیں رہتے اور سردیوں میں خوب برف باری ہوتی ہے۔ایسے شہر میں رہنے سے جاپان کے روایتی معاشرے کو دیکھنے کا موقع بھی یقیناً انہیں ملا ہوگا۔طرح طرح کی باتیں عامر صاحب وقتاً فوقتاً لکھتے آئے ہیں اور اب ''آج کا جاپان'' کتابی شکل میں آئی ہے۔ مجھے پوری طرح یقین ہے کہ آپ اسے پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے اور پڑھنے کے بعد آپ کو جاپانی معاشرے کا اندازہ تو ضرور ہوگا لیکن سب سے مزے کی بات تو ہوگی کی آپ کے سامنے پاکستان اور پاکستانی کا تصور پہلے سے زیادہ نمایاں نظر آئے گا۔'' (۱۶)

خواجہ زکریا، عامر بن علی اور اس کتاب کے بارے کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''عامر بن علی جاپانی معاشرے کے بارے میں اپنے مشاہدات ،تجربات اور احساسات اخباری کالموں کی شکل میں لکھتے رہتے ہیں ۔وہ جاپانی زندگی کی مختلف جہتیں ان ،مکتوبات جاپان ، میں نہایت اچھے انداز میں قلمبند کرتے رہے ہیں اور اخبار کے قارئین ان سے متمتع اور مستفید ہوتے رہے ہیں مگر جیسا کہ مشہور ہے کہ اخبار کی تحریر ایک دن زندہ رہتی ہے۔دوسرے دن بہت سا نیا مواد چھپ جاتا ہے اور اپنی کشش کے باعث گزرے ہوئے دن کی تحریروں کو فراموش کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے مگر کتابی شکل میں یکجا ہو کر مستقل اہمیت اختیار کر لیتا ہے اس لیے ان کالموں کو کتاب کا روپ دینے کا فیصلہ صائب ہے۔''(۱۷)

اس کتاب کے بیک ٹائٹل پر عامر بن علی کی اس کتاب کے بارے(Express Tribune Book Review) سے اور (Daily The Nation Book Review) سے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں اور ساتھ میں مصنف کی مطبوعہ اور زیر طبع کتابوں کی تفصیل درج ہے۔

## ۷۔گفتگو

''گفتگو''۲۰۱۴ء میں پہلی بار نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوئی۔اس کتاب کے پیش لفظ کے عنوان سے ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس کتاب کا انتساب باباجی اشفاق کے نام کیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

''انتساب

باباجی اشفاق احمد

کے

نام''(۱۸)

اس کتاب میں اکیاون (۵۱) نامور شخصیات کے انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر اپنی مفصل بات کرتے ہوئے کچھ اس انداز میں اختتام کرتے ہیں:

''یہ تو میں نے گفتگو کی دیگ میں سے چاول کے دانے نکالے لیکن کتاب کے مطالعے

سے یہ پتا چلتا ہے کہ ساری دیگ ہی ایسی ہے یعنی قاری اس دیگ کے چاولوں سے بقدرِ ظرف لذت یاب ہوسکتا ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں ادبی شخصیات کے انٹرویوز پر مبنی متعدد کتابیں طبع ہوئیں اور فروخت ہوئیں اور حوالے کی چیز بھی ثابت ہوئیں مجھے یقین ہے کہ عامر اور ابرار کی گفتگو بھی ایسی ہی کتاب ثابت ہوگی۔ یہ تو ان دونوں کی پہلی کاوش ہے ابھی تو متعدد سینئر اور جونیئر ادبی شخصیات ایسی ہیں جن کے انٹرویوز بھی ہونے ہوں گے لہٰذا مجھے یہ توقع ہے کہ شاید اگلے دو برس میں قارئین گفتگو۔۲ کا بھی مطالعہ کریں۔''(۱۹)

عامر بن علی کا تخلیقی سفر عام شعرا سے قدرے مختلف ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو دریافت کیا ہے۔ اور اس کے ہاں نکتے بکثرت ہیں جن میں زندگی کی حقیقتیں اور قلب انسانی لطافتوں کو بہ انداز خوش پیش کیا ہے۔ زبان کی شیرینی اور بیان کی خوبی اُس پے مستزاد ہے۔ عالم شباب میں کسی کی اتنی پختہ شاعری میں نے بہت کم دیکھی اور پڑھی ہے۔ ان کی ظاہری شان وشوکت، ان کا جذب دروں، ان کا کمال گفتگو اور سب سے بڑھ کر سادہ وسلیس لفظوں کے جھرمٹ میں معانی کا بحر بیکراں لیے ہوئے ان کے اشعار نے ان کی شخصیت کو ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام عطا کیا۔

عامر بن علی ایک وضع دار انسان با کمال شخصیت کے مالک اپنے انداز کے بے حد کامیاب شاعر اور قابلِ ذکر سفرنامہ نگار ہیں۔ وہ گفتگو کریں نثر لکھیں یا شاعری ان کی لفظیات متاثر کن ہوتی ہیں۔ جن لفظوں کو عام لوگ مشکل سمجھ کر استعمال کرنے سے اجتناب کرتے ہیں ان کا استعمال جناب عامر بن علی کے ہاں معمول کا کام ہے۔ وہ الفاظ کی معنویت ہی نہیں ان کی افادیت اور غنائیت کا بھی بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔ عامر بن علی کی یہ تصانیف ہمارے ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

# حوالہ جات


۱۔ انٹرویو، عامر بن علی، ساجد علی، رہائش گاہ: عامر بن علی، میاں چنوں، ۲۹ جولائی ۲۰۱۸ء، ۱:۰۰ بجے دوپہر

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ شہرت بخاری، سرآغاز، مشمولہ: یاد نہ آئے کوئی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت دوم ۲۰۱۵ء، ص ۱۱

۹۔ امجد اسلام، امجد، جاودانی کا مسافر، مشمولہ: محبت چھوگئی دل کو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت سوم ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۔۱۱

۱۰۔ عطاء الحق، قاسمی، یہ سخن جو تم نے رقم کیے، مشمولہ: محبت چھوگئی دل کو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت سوم ۲۰۱۱ء، ص ۱۳

۱۱۔ اسلم کولسری، کومل جذبوں کا شاعر، مشمولہ: چلو اقرار کرتے ہیں، لاہور: المطبہ العربیہ، اشاعت دوم ۲۰۰۴ء، ص ۱۴

۱۲۔ احمد عقیل، روبی، کچھ سرگوشیاں کے بارے میں، مشمولہ: سرگوشیاں، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت پنجم، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۳

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ انتساب، عامر بن علی، جہاں گردی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۷ء

۱۵۔ انتساب، عامر بن علی، آج کا جاپان، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت دوم جولائی ۲۰۱۷ء

۱۶۔ سویامانے، پروفیسر، تجربہ نامہ، مشمولہ: آج کا جاپان، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت دوم جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۱۷۔ محمد زکریا، خواجہ، جاپان ــــ ایک آئیڈیل ملک، مشمولہ: آج کا جاپان، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت دوم جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۱۸۔ انتساب، عامر بن علی، گفتگو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۴ء

۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پیش لفظ، مشمولہ: گفتگو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵

باب دوم

# عامر بن علی کی غزل کا فکری و فنی جائزہ

باب دوم

# عامر بن علی کی غزل کا فکری وفنی جائزہ

## غزل کا آغاز وارتقاء

غزل اُردو کی نمائندہ صنف سخن ہے اور میرے محدود علم کے مطابق سب سے زیادہ لکھی جانے والی بھی۔ اس صنف سخن کی مخالفت بھی بہت کی گئی لیکن اس میں اتنی صلاحیت موجود تھی کہ ''نیم وحشی صنفِ سخن'' قرار دیے جانے کے باوجود بھی آج تک لکھی جارہی ہے اور لکھی جاتی رہے گی۔

غزل کب اور کیسے وجود میں آئی؟ یہ سوال تفصیل طلب ہے لیکن محققین وناقدین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ عربی قصیدے کے جزو ''تشبیب'' یا ''نسیب'' سے نکلی ہے۔

فارسی میں غزل کو صنف سمجھ کر حکیم سنائی غزنوی نے لکھا جب کہ پہلے صاحب دیوان شاعر رودکی کہلائے۔ (۱)

اردو جس کا پرانا نام ریختہ تھا، کا پہلا شاعر کون ہے؟ اس حوالے سے بھی محققین کی مختلف آراء ہیں۔ کسی نے ولی دکنی (۲) کو تو کسی نے پنڈت چندر بھان برہمن کو اردو کا پہلا غزل گو شاعر مانا ہے۔ (۳)

اردو کا پہلا غزل گو شاعر چاہے جس کو بھی مانا جائے۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس کا آغاز ہند اسلامی تہذیب کے زیرِ اثر ہوا جس کی صراحت گوپی چند نارنگ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''غزل سے متعلق کسی قسم کی گفتگو کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ غزل کے شرارۂ معنوی کا تعلق اس ذہنی شعلے سے ہے جو اسلامی اور ہندوستانی تہذیب کے اختلاط سے پیدا ہوا۔ اس شرارہ کی تب وتاب قائم رکھنے میں سب سے زیادہ مدد اسلامی تصوف سے ملی۔ اردو غزل نے تصوف کی گود میں آنکھ کھولی اور وہ حال وقال کی محفلوں اور صوفیوں اور درویشوں کی صحبتوں میں پروان چڑھی۔''(۴)

درج بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو غزل کو پروان چڑھانے میں مسلمانوں اور اسلامی تہذیب کا زیادہ حصہ ہے اور اگر اسے اسلامی تہذیب، صوفیا اور درویشوں کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا تو موجودہ دور میں

غزل کی صورت یقیناً کچھ اور ہوتی۔ غزل کے آغاز وارتقا کا مختصر جائزہ پیش کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مفہوم و معنی پر نظر ڈالی جائے۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی عربی لغت ''المنجد'' میں یوں ملتے ہیں:

''غَزِلَ، غَزْلاً باالنساء۔ عورتوں سے باتیں کرنا، عورتوں کی خوب صورتی اور جمال کی تعریف کرنا، ان سے عشق بازی کرنا۔''(۵)

غزل اپنی ہیئت سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کے ہر شعر میں شاعر قافیہ و ردیف کی پابندی کے ساتھ مختلف موضوع باندھتا ہے۔ غزل میں چند اجزا ضروری ہیں جن میں مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف اور بحر شامل ہیں۔(۶) بعض اوقات ردیف کے بغیر بھی کام چلا لیا جاتا ہے اور ایسی غزلوں کو ''غیر مردّف غزلیں'' کہا جاتا ہے۔

## غزل کے موضوعات

ابتدا میں غزل اپنی عمومی روش ''سخن با زناں'' کی مناسبت سے عشق و عاشقی کے موضوعات تک ہی محدود رہی۔ مقامی روایت و تہذیب کا عنصر بھی غالب رہا، بعد میں تصوف اور عاشق، معشوق اور رقیب کی مثلث فارسی سے مستعار لی گئی۔ ابتدائی دور کی غزل میں سب سے زیادہ موزوں کیا جانے والا موضوع حسن و عشق ہی تھا۔ اسی وجہ سے غزل پر اعتراضات بھی کیے گئے اور عشق کو ''بے کاری کا مشغلہ'' قرار دیا گیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ زمانی مصلحت کے پیشِ نظر تھا لیکن اس فتوے میں جان ضرور تھی اور اس سے غزل کو بہت فائدہ ہوا۔ اس زمانی و مکانی مصلحت سے قطع نظر محبت کوئی کار بے کاری نہیں ہے بلکہ اللہ نے تو محبت کو وسیلۂ مغفرت قرار دیا ہے:

" قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"(۷)

یہ الگ بات ہے کہ یہاں کس کی محبت بخشش کا باعث ہے۔ بہرحال بخشش کے لیے بھی اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کی مخلوق سے محبت ضروری ہے۔

غزل کے ابتدائی دور کے موضوعات اور موضوعات کی حد بندی، نجم الغنی رام پوری یوں کرتے ہیں:

''غزل میں سوائے ذکرِ شراب و کباب، خال و خط، شاہد رعنا، شکوۂ الم مفارقت، ذکرِ وصال،

بیان جفائے فلک، خوئے بدمعشوق کے اور قسم کے مضمون، مثل نصیحت و معرفت، وعظ و پند
وغیرہ کے زیبا نہیں۔''(۸)

نجم الغنی رام پوری نے موضوعات کو محدود کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا ہے لیکن اس فتوے میں بھی کافی موضوعات گنوا گئے ہیں۔ اگر چہ ان تمام کا پس منظری موضوع عشق ہی ہے تاہم جدید غزل میں اسی روایتی ذخیرۂ الفاظ کو بھی نئے مفاہیم عطا کیے گئے ہیں۔ غالب نے ان ذخیرۂ الفاظ اور رمز و کنایہ کو ضروری قرار دیا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر(۹)

میر و غالب کے دور تک غزل تقریباً نجم الغنی کے بیان کردہ موضوعات تک ہی محدود رہی لیکن ۱۸۶۷ء میں ''انجمن پنجاب'' کے پلیٹ فارم سے کرنل ہالرائیڈ کی ایما پر آزاد اور حالی کی سرپرستی میں شاعری میں موضوعات کی وسعت کی جو تحریک چلی اس نے غزل کو بھی متاثر کیا اور بعد ازاں اقبال کی غزل روایتی غزل سے بالکل مختلف صورت میں سامنے آئی۔

اقبال کی غزل کے بارے میں ڈاکٹر خواجہ زکریا رقم طراز ہیں:

''اقبال کی غزل بھی ایک بڑا انقلابی تجربہ ہے۔ اقبال نے اپنی نظموں میں جو افکار پیش کیے ہیں وہ بال جبریل کی غزلوں میں دہرائے گئے ہیں۔ اس طرح غزل خودی، بیخودی، مردِ مومن، موت و حیات، تقدیر و تدبیر، سکون و جستجو وغیرہ کے موضوعات کا ذریعۂ اظہار بن گئی۔ اس غزل میں مابعد الطبیعاتی مسائل کی طرف بھی اشارے ہیں اور دنیا میں ایک آئیڈیل زندگی گزارنے کی تلقین بھی۔''(۱۰)

اقبال کے بعد فیض نے اپنی نظموں اور غزلوں میں اگر چہ ذخیرۂ الفاظ روایتی ہی استعمال کیا تاہم لفظوں کو مفاہیم نئے عطا کر دیے۔ فیض شاعری کی مستحکم روایت میں سنگم پر کھڑے اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ فیض نے شاعری میں سیاسی موضوعات کے دخول میں اہم کردار ادا کیا۔

غزل کے جدید شعرا نے تو یہ ثابت کر دیا کہ غزل میں ہر طرح کے موضوعات سمونے کی صلاحیت موجود ہے۔ جدید غزل میں ''وصفِ عشق اور عورتوں کے اظہارِ محبت کے علاوہ مذہبی، فلسفیانہ، حکیمانہ، سائنسی، اخلاقی اور تہذیبی موضوعات بھی

زیرِ بحث آتے ہیں۔''(۱۱)

یوسف حسین خاں غزل میں موضوعات کی وسعت کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:

''جدید فلسفے اور سائنس نے ہمارے تصورات کی دنیا میں بڑی وسعتیں پیدا کر دی ہیں جن سے پرانے شاعر بے خبر تھے۔''(۱۲)

## غزل میں نئے تجربات

نظم میں تو تجربات کے لیے ہر طرح کی موضوعاتی اور ہیئتی گنجایش شروع سے ہی موجود ہے لیکن غزل میں ہیئتی تجربات کی گنجایش بالکل نہیں کیونکہ غزل کی پہچان ہی اس کی ہیئت ہے۔غزل میں ہر طرح کے موضوعات کو موزوں کیا گیا اور غزل کی کشادہ دلی نے ان کو قبول بھی کیا لیکن ہیئت کے تجربات کو نہ تو غزل نے قبول کیا اور نہ ہی اس کے قاری نے۔

غزل کے مقابلے میں آزاد غزل یا اینٹی غزل لکھی گئی جس میں قافیہ اور ردیف سے انحراف کے ساتھ ساتھ مصرعوں میں بھی کمی بیشی کی گئی اور غزل کے شعر میں دو مصرعوں کی بجائے سوا یا ڈیڑھ مصرعے کا شعر کہا گیا۔

غزل میں ہیئت کے پہلے تجربے کے حوالے سے ڈاکٹر انور صابر لکھتے ہیں:

''غالباً ۱۹۶۳ء میں بمبئی (بھارت) کے ایک شاعر مظہر امام نے ایسی غزل کہہ دی جس کا ہر شعر چھوٹے بڑے مصرعوں پر مشتمل تھا۔ اگرچہ مظہر امام نے اس فن پارے میں غزل کے لوازمات بحر، مطلع، مقطع، ردیف اور قافیہ کا التزام کیا تھا مگر ہر شعر کے مصرعوں کے ارکان کم وبیش رکھے۔ اسے انھوں نے آزاد نظم کا نام دیا۔''(۱۳)

افتخار شفیع کے نزدیک ''اردو میں آزاد غزل کا پہلا تجربہ ظفر اقبال نے کیا۔''(۱۴) جو کہ غلط ہے کیونکہ ظفر اقبال نے اگرچہ آزاد غزل ۷۰ء کی دہائی میں لکھی تاہم انھوں نے یہ کام تجرباتی طور پر نہیں بلکہ آزاد غزل کی تحریف کے طور پر کیا ہے اور وہ ذاتی طور پر آزاد غزل کے مخالف ہیں۔(۱۵) آزاد غزل لکھنے والوں میں مظہر امام، قتیل شفائی، فارغ بخاری، ظفر اقبال (اگرچہ انھوں نے تحریف کی ہے)، ماجد الباری، سجاد مرزا، فرحت نواز، خاور اعجاز، حیدر قریشی، یوسف مثالی، معبود آمر، اظہر ادیب اور ظفر ہاشمی شامل ہیں۔

آزاد غزل کا تجربہ کرنے والوں میں اس تجربے کی وجہ سے شہرت کسی کو بھی نہ مل سکی اور شاید مل بھی نہیں سکتی کیونکہ

قافیے اور ردیف کی پابندی سے انحراف کے ساتھ مصرعوں میں کمی وبیشی کے تجربات نظم میں کرنے کی گنجایش ہے اور وہ کامیابی کے ساتھ کیے بھی جا چکے ہیں۔ نظم موضوع اور عنوان کی مناسبت سے نظم کہلاتی ہے جبکہ غزل ہیئت کا نام ہے اور اس کی ہیئت کو تبدیل کرنا گویا کوئی اور ہی چیز دریافت کرنا ہے۔ انسان کسی بھی رنگ اور طرز کا لباس پہن کر انسان ہی رہے گا لیکن شکل تبدیل ہونے سے وہ انسان نہیں رہے گا۔

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں بھی غزل کے یہی لغوی معان درج ہیں:

''ب: ہرن کی وہ ضعیف، دردناک، پُرسوز اور رحم انگیز آواز جو شکاری کتوں میں گھر جانے کے وقت اس کے حلق سے نکلتی ہے۔''(۱۶)

رفیع الدین ہاشمی غزل کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''غزل وہ صنف شعر ہے جس میں حسن وعشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہو اور اس میں درد وسوز بہت نمایاں ہو۔۔۔ غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنا اپنا الگ مفہوم دیتا ہے۔''(۱۷)

لغاتِ کشوری میں غزل کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے:

''غزل وہ کلام جس میں عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف اور عشق و عاشقی کا ذکر ہو۔''(۱۸)

درسی اُردو لغت میں درج ہے:

''غزل: غَ + زَل۔

۱۔ عورتوں سے بات چیت، محبوب سے عشق کا ذکر۔

۲۔ وہ اشعار جن میں ہجر و وصال، حسن وعشق جمال، عشق ومحبت کا ذکر ہو۔ غزل کا ہر شعر جداگانہ مضمون رکھتا ہے۔ غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں لاتعداد مضامین سموئے جا سکتے ہیں اب تو فلسفہ اور معرفت کے مضامین بھی غزل میں راہ پا گئے ہیں۔''(۱۹)

اعجاز اللغات میں غزل کے معنی اس طرح سے ہیں:

''۱۔غزل عورتوں سے باتیں کرنا۔

۲۔عورتوں کے حسن کی تعریف وتوصیف کرنا۔

۳۔شاعری کی ایک صنف۔اس کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اور آخری مقطع کہلاتا ہے۔ یہ ہر بحر میں لکھی جاتی ہے اور اس کے ہر شعر میں الگ مضمون باندھا جا سکتا ہے۔تاہم تمام اشعار میں قافیے اور ردیف کی پابندی ضرور کی جاتی ہے۔پرانے زمانے میں اس میں عورتوں سے متعلق یا حسن وعشق کے مضامین کا بیان ہوتا ہے لیکن جدید غزل میں ہر طرح کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔''(۲۰)

نور اللغات میں غزل کے بارے میں درج ہے:

''غزل کے پہلے شعر کو مطلع، آخری کو مقطع اور سب سے عمدہ بیت کو تاہ بیت کہتے ہیں۔ مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور باقی اشعار کے باقی مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔''(۲۱)

شمس قیس رازی کا بیان کردہ تمثیل غزل کے مزاج کو سمجھنے کا اوّلین ذریعہ ہے:

''آہو جب شکاری کتوں کو دیکھتا ہے، پہلے تو بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔مگر جب بھاگتے بھاگتے عاجز آجاتا ہے اور تھک کر رہ جاتا ہے تو عالم بے بسی ومجبوری میں اس کی زبان سے بے ساختہ چیخ نکلتی ہے جس میں اتنا درد ہوتا ہے کہ شکاری کتوں کے دل میں بھی ایسی رقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے شکار کو بلکہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں اور اس چیخ کے اثر میں کچھ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ انہیں اپنا مقصد بھول جاتا ہے۔''(۲۲)

اصطلاحی معنوں میں ایک مدت تک غزل سے مراد دردناک غم کی وہ کیفیات تھیں۔جنھیں شاعری کے لیے موضوع بناتے تھے۔غزل مسائل حیات کی ترجمان ہے۔اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔شاعر غزل کے ذریعے اظہار کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔غزل میں بہت زیادہ کشش موجود ہے اس میں اظہار کی وسعت بھی ہے اور موضوعات کی رنگارنگی بھی

یہی ہے کہ اُردو ادب کے پاکستانی دور میں غزل بھی مقبول عام ہوئی۔

سلام سندیلوی غزل کے بارے میں کہتے ہیں:

''داخلی شاعری کی بہترین مثال غزل ہے جو شاعر کی دروں بینی کا نتیجہ ہوتی ہے۔''(۲۳)

غزل کا شاعر دل کی دنیا سے وابستہ ہوتا ہے اور کائنات دل میں جو جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ انہیں پینٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ گویا غزل غم دنیا اور غم دل دونوں کی ترجمان ہے۔ میرے کے بارے میں ایک جملہ مشہور ہے کہ ان کی غزل میں دل اور دلی ایک ہے یعنی دل کا دکھ اور دلی کا دکھ اور دل کی تباہی و بربادی اور دلی کی تباہی و بربادی ایک ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے غزل میں کئی نئے رنگ آئے ہیں۔ لیکن فنی اور ہیئتی اعتبار سے غزل میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔

مختصر بیانی نے غزل کو ایک متمدن صنف سخن بنا دیا ہے اور ایمائیت اس کی خوبی ہے۔ ایمائیت، رمزیت اور اشاریت غزل کے زیور ہیں۔ یہ وہ استعارے ہیں جن کے توسط سے شاعروں نے اپنے دکھوں کے ساتھ دوسروں کے دکھ بھی بیان کیے ہیں۔ سماجی و سیاسی حالات کو صفحہ قرطاس پہ بکھیرا ہے۔

سید عابد علی عابد نے اُردو غزل کی علامات کو عالم طلسمات قرار دیا ہے۔(۲۴)

غزل کی صنف جامد و ساکت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو بڑھتا اور پھلتا پھولتا رہا ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک آزاد اکائی ہے اور وہ خود میں ایک مکمل مضمون ہے۔ اس کا اپنا ایک مزاج ہے اپنی زبان ہے۔ غزل کے اشعار کا آپس میں مربوط ہونا ضروری نہیں ایک ربط اور تسلسل نہیں ہوتا۔ ایک شعر دوسرے شعر کے ساتھ مل کر معنی نہیں دیتا بلکہ ہر شعر خود میں مکمل ہوتا ہے ایک پوری واردات، ایک واقعہ ایک بات مکمل اس میں موجود ہوتی ہے۔ نفسیاتی طور پر انسان کسی ایک موضوع پر زیادہ دیر توجہ نہیں دے سکتا اور غزل انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ غزل میں بنیادی طور پر غنائیت آور آشفتگی کا ہونا ضروری ہے۔

غزل میں ہر شعر منفرد اکائی ہے۔ اسی لیے ایک شعر کا دوسرے سے معنوی اور منطقی ربط نہیں ہوتا۔ غزل وحدت کے برعکس کثرت کی مظہر ہوتی ہے اور مخالفین کے بموجب فکری انتشار، پریشان خیالی، ریزہ خیالی، متنوع، متضاد اور متناقص خیالات وتصورات کا ڈیپارٹمنٹل سٹور ہے یا پھر ایسی گلی جس کے مکین ایک دوسرے سے لاتعلق ہوتے ہیں غزل کے برعکس نظم کی تمام اصناف اور ان کی ہیئتوں میں موضوع کی مناسبت سے منطقی ربط ہوتا ہے۔ اسی لیے نظم یک موضوعی ہوتی ہے۔ چار مصرعوں کی

رباعی ہو یا چار ہزار مصرعوں کی مثنوی موضوع سے ان کی فکری اساس مستحکم ہوتی ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''غزل گو بڑے بڑے خیال، تخیل، تصور کو دو مصرعوں کے کوزے میں بند کر دیتا ہے۔ اسی لیے وہ جزئیات، کوائف اور تفصیلات سے پرہیز کرتے ہوئے ایمائی اسلوب اپناتا ہے، مگر نظم گو تخلیق کے آسمان کا آزاد پکھیرو ہے اس لیے وہ آفاق کی منزلیں سر کر سکتا ہے۔غزل میں قافیہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی مدد سے خیال الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر مخصوص ہیئت اختیار کرتا ہے۔قافیہ کی وجہ سے غزل کے تخلیقی عمل میں تلازم خیالات اساسی کردار ادا کرتا ہے واضح رہے کہ تلازمِ خیالات لاشعوری اثرات سے مشروط ہوتے ہیں جبکہ فینٹسی اور آزاد تلازمہ بھی اُسی کے دوسرے روپ ہیں اور یہی ''آزاد خیالی'' غزل میں مجسم ہو کر شعر کا پیکر اختیار کرتی ہے غزل کے شعر میں موضوع کا منطقی پھیلاؤ نہیں ہوتا اسی لیے یہاں جذبات و احساسات اور ہیجانات کا سکہ چلتا ہے۔''(۲۵)

غزل ایسی مقبول صنف سخن ہے کہ اُردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے غزل کو اپنا ذریعہ اظہار نہ بنایا ہو حتیٰ کہ نظم گو شعرا نے بھی غزلیں کہی ہیں۔ مجید امجد، ن۔م۔راشد، میراجی، جوش، وزیر آغا، آفتاب اقبال، شمیم، نصیر احمد ناصر نے بھی غزل کے ذریعے اپنا اظہار کیا ہے۔

غزل کی ایک خوبی یہ ہے۔شاعر کسی خارجی واقعے کو فوری طور پر شعر میں بیان نہیں کر دیتا بلکہ استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جذبات کی شدت پر ردِعمل ظاہر نہیں کرتا۔غزل کو ہم ایسی صنف سخن کہہ سکتے ہیں جو:

''زمان و مکان میں بکھرے ہوئے اور پھیلے ہوئے واقعات کا ست یا جوہر نکال لیتی ہے۔''(۲۶)

موجودہ زمانے کے تیز رفتار تقاضوں کو صرف غزل ہی نبھا سکتی ہے اور یہ غزل ہی کے بس کا کام ہے دوسری تمام اصناف سخن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے قاری کے پاس وقت فرصت شوق کا زیادہ ہونا ضروری ہے۔جبکہ غزل کے لیے زیادہ وقت اور توجہ کا ہونا ضروری نہیں۔غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک پیغام لیے ہوتے ہوتا ہے۔پیغام اور تکمیلیت کے علاوہ اس میں

معنی آفرینی، حلاوت، نغمگیت اور ترنم کا ہونا لازم ہے اور غزل کا قاری ایک ہی شعر میں یہ سب کچھ پالیتا ہے۔ بلکہ قدم قدم پر اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ میرے ہی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ایسا تو میں بھی چاہتا تھا، یہ تو میں بھی کہتا ہوں۔ غرض قاری ہر لحاظ سے غزل میں رچ بس جاتا ہے۔ اس میں کھو جاتا ہے اور جب غزل کے سمندر میں ڈوب کر ابھرتا ہے تو بہت سا حظ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ الغرض غزل قاری کے لیے دلی تسکین کا باعث ہے۔

غزل اس صنف ادب کو کہتے ہیں جس میں واردات و کیفیات قلبی کو بیان کیا گیا ہو جن کا تعلق حسن و عشق سے ہو لیکن بعض لغت نویس لفظ غزل کو غزال سے بھی مشتق قرار دیتے ہیں۔ عربی زبان میں ''غزال'' ہرن کو کہتے ہیں۔ ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' میں بھی غزل کے یہی لغوی معنی بیان کیے گئے ہیں۔

> ''ہرن کی وہ ضعیف دردناک پُرسوز اور رحم انگیز آواز جو شکاری کتوں میں گھِر جانے کے وقت اس کے حلق سے نکلتی ہے۔''(۲۷)

غزل کے لغوی معنی کم و بیش سبھی لغات میں یہی ملتے ہیں عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے متعلق باتیں کرنا علاوہ ہرن کے منہ سے دردناک آواز شکاری کتوں میں گھِر جانے کے بعد نکلتی ہے اس کو بھی غزل کا نام دیا جاتا ہے۔ غزل کی کوئی جامع تعریف کرنا مشکل ہے تاہم چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔

مولوی سیّد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

> ''اصطلاح میں وہ نظم جس میں حسن و جمال فراق وصال عشق وفریفتگی، شراب و کباب و معرفت وغیرہ کا ذکر یا ہجو و نصیحت وغیرہ ہو یا وہ نظم جس میں عاشق وصال و فراق کے خیالات کو وسعت دے کر دل کے ارمان یا غم کا نجار نکالے غزل کے اشعار کم سے کم پانچ اور کثرت میں لا انتہا ہو سکتے ہیں۔ طاق ہونا شرط ہے۔ غزلیں سب بحروں میں کہی جاتی ہیں پہلے غزل مسلسل بھی ہوا کرتی تھی۔ مگر اب اس کا رواج اٹھ گیا۔ ہر شعر جداگانہ مضمون کا ہونے لگا۔ البتہ قطعہ بند میں بات نہیں ہے۔ مطلع کے دونوں مصروعوں میں قافیہ مشابہت رکھتا ہے باقی اشعار میں پہلے مصروعوں کا قافیہ ندارد اور دوسرے مصروعوں کا قافیہ مطلع کے موافق ہوتا ہے۔''(۲۸)

ڈاکٹر سہیل احمد لکھتے ہیں:

''غزلوں کے دو لفظی مطالب زیادہ معروف ہوئے۔

ا۔عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں گفتگو کرنا۔اس جملے میں عورت سے مراد محبوب ہے۔

۲۔ ہرن کی وہ درد ناک آواز جو شکاری کتوں میں گھِر جانے کے باعث نکالتا ہے۔''(۲۹)

رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''اصطلاحاً غزل کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے ہر شعر اپنا اپنا الگ مفہوم دیتا ہے۔''(۳۰)

ان لغوی معنوں کی روشنی میں غزل کا مفہوم اس صنفِ سخن کا ہے جس میں عشق و محبت، حسن و شباب، واردات و کیفیات محبت کو بیان کیا گیا ہو۔ یہ غزل کے لغوی یا تمثیلی معانی ہیں۔اس کی حتمی اصطلاح تعریف کرنا مشکل ہے۔ دیکھا جائے تو یہ غزل کی کوئی مطمئن کرنے والی تعریفیں نہیں ہیں۔غزل کی سب سے بڑی پہچان اس کی ہیئت ہے۔موضوع کی کوئی پابندی اس میں دیکھنے کو نہیں آتی۔ایک عرصے تک اس کو حسن و عشق کی واردات و کیفیات کے بیان تک محدود سمجھا گیا لیکن بغور دیکھا جائے تو اس دور میں اس کا یہ موضوع مخصوص نہیں رہا اس میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔موضوع کی کسی قید کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ ہیئتی طور پر اسے منفرد کرنے والے اجزائے ترکیبی مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف اور بحر ہیں۔

مطلع کے معنی طلوع ہونے کے ہیں۔غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں مطلع کہلاتا ہے۔شاعر ایک سے زیادہ مطلع بھی لا سکتا ہے۔جن کو بالترتیب مطلع اول، ثانی، ثالث کہا جاتا ہے۔اسی طرح مقطع کے معنی قطع ہونے کے ہیں۔ یہ غزل کے آخری شعر کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔اگر تخلص نہ لائے تو محض آخری شعر کہلاتا ہے۔اس ضمن میں بھی شعرا کے ہاں آزادروی دیکھنے میں آتی ہے۔شاعر کسی بھی شعر میں تخلص لا سکتے ہیں۔

قافیہ وہ ہم وزن اور ہم آواز الفاظ ہوتے ہیں جو مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور باقی اشعار میں دوسرے مصرعے میں ردیف سے پہلے آتے ہیں۔ ردیف بھی غزل کا سنگھار ہے۔ یہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جو مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی کے

اشعار کے دوسرے مصرعے میں قافیہ کے بعد بار بار دہرائے جاتے ہیں۔غزل کے لیے قافیہ لازمی ہے ردیف نہیں۔تاہم ردیف آہنگ وموسیقیت پیدا کرنے کے علاوہ مطلب سمجھانے میں بھی مدد فراہم کرتی ہے۔

غزل کے تمام اشعار میں بحر کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ساری غزل شروع سے لے کے آخر تک ایک بحر میں ہوتی ہے۔غزل کے اشعار کی تعداد اور موضوع کی قید بے بنیاد باتیں ہیں۔غزل میں عشق و عاشقی کے مضامین کے علاوہ مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، نفسیاتی، معاشی، تہذیبی، فلسفیانہ، حکیمانہ، مزاحیہ موضوعات کی بوقلمونی اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔غزل میں بڑی حد تک لچک موجود ہے۔سادگی زبان و بیان، ایجاز واختصار، صنائع بدائع کا استعمال، روانیو آہنگ، درد وسوز، بے ساختگی، تشبیہ، استعارہ کے حسن کے علاوہ تغزل کی موجودگی غزل کے اشعار کی نمایاں صفات ہیں۔

غزل عربی قصیدے کی تشبیب کی الگ صورت ہے یعنی جب قصیدے سے تشبیب کو جدا کیا گیا تو وہ غزل کہلائی، مگر عربی میں غزل علیحدہ صنفِ سخن کے طور پر کبھی رائج نہیں رہی۔صنف کے طور پر غزل کا اول اول استعمال فارسی میں ہوا۔بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری:

> ''غزل عربی لفظ ہے جس کے معنی محبوب کی باتیں کرنے کے ہیں اور غزلیت یا تغزل یعنی ایک خاص انداز کا باوقار اور سنجیدہ گداز جو عشق کی پہچان ہے۔اہلِ عرب کے نزدیک بھی اچھی شاعری کی ممتاز علامت ہے لیکن شاعری کی ایک مخصوص صنف کی حیثیت سے غزل عرب کی پیداوار نہیں۔یہ جنس گراں ایران میں پیدا ہوئی۔وہیں اس کا بازار گرم ہوا اور وہیں سے ہندوستان آ کر اردو میں رواج پایا۔''(۳۱)

تشبیب میں عام طور پر عشق و عاشقی کے مضامین بیان ہوتے تھے اور قصیدے اور غزل میں بعض قدریں بھی مشترک ہیں اسی وجہ سے غزل کو عشقیہ مضامین کے بیان کے لیے محدود سمجھا گیا۔فارسی میں جس شاعر نے غزل کو الگ صنف سمجھ کر لکھا وہ حکیم سنائی غزنوی ہیں۔ان کے دیوان میں کثیر تعداد میں غزلیں پائی جاتی ہیں۔دیگر فارسی شعرا جنھوں نے اس صنف میں نام پیدا کیا ان میں حافظ شیرازی، انوری، نظیری، سعدی، خاقانی، عرفی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

> ''بہت سے نقاد ولی دکنی کو اردو کا پہلا غزل گو شاعر لکھتے ہیں اور اسے غزل کا باوا آدم قرار دیتے ہیں۔''(۳۲)

مگر یہ بات ضرور ہے کہ اردو غزل اپنی آب وتاب کے ساتھ پہلی بار ولؔی کے ہاں ہی نظر آتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ولؔی سے پہلے غزل کا وجود نہیں تھا فارسی کے تتبع میں ہی اردو غزل کا چلن ہوا۔ اس لیے فارسی غزل کے تمام لوازمات اردو میں شامل ہو گئے۔ حضرت بابا فرید شکر گنج سے جو کلام منسوب کیا جاتا ہے اس میں غزل کے آثار ریختوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد جہاں کے عہد کے پنڈت چندر بھان برہمن کی اردو غزل کا ذکر کرتے ہوئے اسے اردو غزل کا پہلا نمونہ قرار دیتے ہیں۔

لکھتے ہیں:

''اگر برہمن کی غزل کو اردو کی پہلی باقاعدہ غزل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔''(۳۳)

عالمگیر کے عہد میں ناصر علی سرہندی کے ہاں بھی غزل کے نمونے ملتے ہیں۔ ادھر دکن بہمنی دور میں مثنوی غالب رہی، عادل شاہی دور میں حسن شوقی نمایاں غزل گو شاعر ہے۔ جمیل جالبی کے مرتب کردہ حسن شوقؔی کے دیوان میں کافی تعداد میں غزلیں موجود ہیں۔ قلی قطب شاہ کا دیوان صنفِ غزل سے مالا مال ہے انہوں نے پہلی بار غزل بھرپور انداز میں کہی۔ ولؔی دکنی نے غزل پر خصوصی توجہ کی، وہ ایک عہد ساز شاعر تھے جنہوں نے نہ صرف اردو غزل کے صحیح خدوخال اجاگر کیے بلکہ ریختہ گوئی کو ایک تحریک کی صورت بخشی۔ اس سلسلے میں ولؔی دکنی کے دہلی کے سفروں کو خصوصیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ بعد میں جب ان کا دیوان دہلی پہنچا تو اس نے دہلی کے فارسی گو شعرا کو اردو میں طبع آزمائی پر راغب کیا۔ ولؔی کے معاصر سراج اورنگ آبادی کا نام بھی دکن میں غزل کے میدان میں ولی کے بعد اہم ہے۔

ایہام گو شعرا کے بعد اردو شاعری کا عہدِ زریں شروع ہوا، جسے میرؔ وسوداؔ کے دور سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور میں میر تقی میرؔ جیسا خدائے سخن بھی شامل ہے۔ جس نے اردو غزل کو دائمی زندگی بخش دی۔ خواجہ میر دردؔ نے غزل میں تصوف کے مضامین داخل کیے۔ سوداؔ کا نام قصیدے میں رفعت کا حامل ہے مگر انہوں نے غزل میں بھی مقدار میں کم لیکن معیار میں اعلیٰ سرمایہ چھوڑا ہے۔ میر حسنؔ نے بھی مثنوی کے ساتھ غزل میں اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ قائمؔ، اثرؔ، سوزؔ اس دور کے اہم غزل گو شاعر ہیں۔

دہلی کی محفل اجڑنے کے بعد لکھنؤ میں الگ دبستان کی بنیاد پڑی۔ پہلا دور مصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان شعرا نے دبستانِ دہلی کے برعکس خارجیت پر زور دیا۔ دبستانِ لکھنؤ کی تکمیل آتشؔ و ناسخؔ نے کی۔ ناسخؔ سب

سے منفرد غزل گو تھے۔ آتش نے غزل میں سادگی زبان پر زور دیا۔ ان کی غزل میں روانی و موسیقیت پائی جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے بھی نظم کے ساتھ غزل کی ہیئت میں بے شمار لکھا۔ ان کی غزل بھی ان کی قادر الکلامی کی عکاس ہے۔

دبستانِ دہلی کے متاخر شعرا میں شاہ نصیر، ابراہیم ذوق، اسد اللہ غالب، مومن اور ظفر جیسے بڑے شاعر ہیں۔ اس دور کو غالب اور مومن کا دور کہا جاتا ہے۔ مومن تک آتے آتے اردو غزل کی زبان بڑی حد تک صاف ہو چکی تھی۔ ان شعرا نے صنفِ غزل کو عروج تک پہنچا دیا۔

جنگِ آزادی کے بعد مولانا حالی نے شاعری کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس دور میں غزل کے بجائے نظم کو مقبولیت حاصل رہی مگر غزل کو سنوارنے والوں میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، شاہ عظیم آبادی، فانی بدایونی، فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، جوش اور اقبال وغیرہ اہم ہیں۔ غالب کے بعد اقبال نے اردو غزل میں معنوی، موضوعاتی وسعت پیدا کی، اس دور کے شعرا کے ہاں ملّی و قومی احساس نمایاں ہے کیونکہ یہ سیاسی بیداری کا دور تھا۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر کہی جانے والی غزل انقلاب اور مساوی حقوق کے نعروں سے لبریز ہوئی۔ ترقی پسند شعرا میں فیض، مجروح، جوش، مجاز، فراق، تاثیر، ساحر لدھیانوی اور بعد میں احمد ندیم قاسمی جیسے نام اہم ہیں۔ حلقہ اربابِ ذوق کے نمائندوں میں میراجی، قیوم نظر، یوسف ظفر، انجم رومانی، مختار صدیقی وغیرہ نے اگرچہ نظم اور گیت پر اپنی صلاحیتیں صرف کی مگر غزل کو بھی نیا آہنگ دیا۔

تقسیمِ پاک و ہند کے بعد غزل نئے طرزِ احسان سے آشنا ہوئی قیام پاکستان کے بعد جن ترقی پسند شعرا نے نئے مقاصد مدِ نظر رکھے اور جبریت کے خلاف آواز بلند کی ان میں نئے نام خاطر غزنوی، احمد فراز، محسن احسان، جمیل ملک اور عطا شاد وغیرہ کے ہیں۔ روایت پر قائم رہنے والے شاعروں میں تابش دہلوی، عبدالحمید عدم، سیف الدین اور احسان دانش ہیں۔ غزل کو نیا احساس فراہم کرنے والوں میں سجاد باقر رضوی، مجید امجد اہم نام ہیں۔ وہ شاعر جن کے ہاں روایت اور جدت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے ان میں ناصر کاظمی، منیر نیازی، شہزاد احمد کے نام اہم ہیں۔ ۶۰ کی دہائی میں ابھرنے والے نمایاں غزل گو شعرا میں ظفر اقبال، احمد مشتاق، سلیم احمد، ساقی فاروقی، شیر افضل جعفری، عبدالعزیز خالد، اقبال ساجد، جون ایلیا، انور مقصود، احسن اختر، شکیب جلالی، افتخار عارف، ریاض مجید وغیرہ نمایاں ہیں۔ ۷۰ کی دہائی میں ابھرنے والے نمایاں غزل گو شعرا میں غلام محمد قاصر، پروین شاکر، صابر ظفر، شوکت ہاشمی، جلیل عالی، نسیم سحر، جمال احسانی، اسلم انصاری، خورشید رضوی، ثروت

حسین، اسلم کولسری وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ موجودہ دور میں بھی غزل بڑی شدومد کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

غزل کی اس مستحکم روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک اردو کا وجود ہے غزل اس کا حصہ رہے گی۔ غزل اور اردو لازم وملزوم ہیں۔ ہر دور میں غزل گو شعرا کی کثیر تعداد اس کی مقبولیت کی دلالت رہی ہے۔ غزل میں عہد تبدیلی وترقی کا عمل جاری ہے اور یہ آج تک جاری وساری ہے۔

# عامر بن علی کی غزل کا فکری جائزہ

انسان اس کائنات میں آتے ہی اپنے لیے بہتر سے بہتر سبب کی تلاش کرنے لگا۔اس کی یہ جستجو کسی ایک نقطہ پر جا کر ختم نہ ہوئی بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک نیا پہلو اس کے سامنے آنے لگا۔ یہ سب صرف اور صرف انسان کی سوچ اور فکر پر مبنی تھا۔ انسان نے اپنی سوچ اور استعداد و قابلیت کے مطابق خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت اور وسائل سے اپنے لیے نئے راستے تراشے، گویا کہ جلد ہی انسان اس کائنات میں وہ جو اشرف المخلوقات بن کر آیا تھا اس کا عملی مجسمہ نظر آنے لگا۔اور وہ نئی سے نئی چیزیں ایجاد کر کے تمام مخلوقات پر اپنی برتری واضح کرنے لگا۔لہٰذا انسان کے اس عمل و کردار نے اسے مزید ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔یہی وجہ تھی کہ انسان فی زمانہ تک ترقی کرتے کرتے اوج و کمال پر پہنچ گیا۔لیکن انسان کی سوچ و بچار، فکر، اس کا تخیل، مشاہدہ، تجزیہ اور کچھ نیا کرنے کا جذبہ کم نہ ہوا بلکہ مزید ترقی کے ساتھ ساتھ وہ چیزوں کو اور بھی فروغ دینے لگا۔

انسان کے سوچنے اور خیال کرنے کا عمل مزید آگے بڑھا تو اسے کئی درجہ بندیاں میسر آئیں۔کہیں مذہبی لوگ، تو کہیں معاشرتی، کہیں علم و ادب سے تعلق والے لوگ تو کہیں شاعر اور فلاسفر بھی اسی رویہ کے ارتقا میں شامل ہوئے۔آہستہ آہستہ شعرا نے اپنے خیال کی بلندی اور تخیل کی پرواز سے اپنا لوہا منوایا۔اردو شاعری نے اس میں اپنا خاص حصہ ڈالا اور ہر دور میں شعرا کرام کے ہاں نئے نئے فکری پہلو انسانی ترقی اور مختلف سے ایجادات کا ذریعہ بنتے رہے ہیں۔

اردو شاعری ولی سے لے کر جدید دور تک تخیل کی راہ پر مستفیض رہی ہے۔گویا کہ انسان نے شاعری کو تخیل کا لازمی حصہ سمجھا اور شاعری کو تخیل اور فکر کی پرواز سے مزین کیا۔مولانا الطاف حسین حالی مقدمہ شعر و شاعری میں رقم طراز ہیں:

> ''سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعری کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے۔قوتِ متخیّلہ یا تخیل ہے۔جس کو انگریزی میں امیجینیشن کہتے ہیں۔یہ قوت جس قدر شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جس قدر ادنیٰ درجہ کی ہوگی اس قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔''(۳۴)

جب ہم مختلف شعرا کے ہاں تخیلات اور افکار کی بحث دیکھتے ہیں تو ان میں ایک نام عامر بن علی کا بھی نظر آتا ہے۔

عامر بن علی کا تخیل اور فکر اپنے ہاں ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور وہ معاشرے کو اپنی سوچ کے ذریعہ سے نئے فکری پہلوؤں سے روشناس کراتے ہیں۔ وہ محبوب کی آڑ میں اپنا اصل خیال اپنے قاری تک ضرور پہنچا دیتے ہیں۔

کہیں بھی چین نہیں ہے بچھڑ کے یاروں سے
سکوں کی کھوج میں مَن جا بجا بھٹکتا ہے(۳۵)

عامر بن علی کی سوچ نئے زاویے سے سفر کرتی ہے۔ جس میں وہ محبوب کی بات بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور واعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ یہی شاعری کا حسن ہے۔ جو ہمیں عامر کے ہاں مکمل نظر آتا ہے اور فکری پہلوؤں کے لیے پورا اترتا ہے۔

اردو شاعری کی روایت میں حسن و عشق اور محبوب کو خاص جگہ دی گئی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ تخیل اور نئی سوچ کا اپنا ایک معیار ہے۔ عامر بن علی اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ شعر کے لیے ضروری تخیل کو بھی پورا کرتے ہیں جبکہ دوسری جانب اپنے قاری کے دل کی تشفی کے لیے حسن و عشق اور محبوب کا نام بھی الاپتے ہیں۔ گویا کہ تخیل اور فکر کا شاعری میں اپنا الگ ایک مقام ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب اپنی کتاب ہماری شاعری میں یوں رقم طراز ہیں:

''فرضی باتوں سے دل پر اثر ڈالنا بھی شاعری ہے مگر اصلیت میں دل کشی پیدا کرنا شاعری کی معراج ہے۔ خیال کی اصلیت کے لیے اس کے ہر جزو میں الگ الگ اصلیت ہونا کافی نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر اپنے خیال میں جن چیزوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے ان کا یک جا ہونا عادت یا واقع یا مسلمات کے خلاف نہ ہو چونکہ شعر کی غایت میں دل کو متاثر کرنا ہے۔''(۳۶)

شاعری اچھے خیال ہی کا دوسرا نام ہے۔ ایک شاعر کے ہاں اس کی اچھی سوچ اور فکر کے تلازم سے شاعری جنم لیتی ہے۔ عامر بن علی کے فکری پہلو اس امر کا اظہار کرتے ہیں گویا کہ شعر کے اندر شاعر کا تصور یا فکر ایک اہم سرچشمہ ہے۔ جو ہمیں عامر کے ہاں بھرپور نظر آتا ہے۔

## تصورِ عشق و محبت

کسی بھی شاعر کے ہاں عشق و محبت کی داستان ہمیں ہر لحاظ سے بکھری نظر آتی ہیں۔ اس کی شاعری ان داستانوں سے

ماورانہیں ہوتی کیونکہ اردو شاعری میں ہجر و وصال، گل و بلبل اور عشق و محبوب کے قصے اپنی ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں گویا کہ اردو شاعری کے آغاز ہی سے ان تصورات کو من و عن تسلیم کیا گیا جو ہمیں فارسی سے ملے تھے۔ جن میں محبوب کا حسن ہجر، وصال، خوبصورتی، محبت، پیار اور عشق کی داستان شامل ہے۔ عامر بن علی کے ہاں یہ داستانیں باقی شعرا کی طرح عام اور نمایاں ہے۔ وہ بھی محبوب کے چہرہ اور اس کے عشق کی بات کرتے ہیں مگر اس عشق میں ایک جدت اور ندرت کا عنصر ہمیں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ احمد عقیل روبی لکھتے ہیں:

> ''کچھ لوگ محبوب کے ہر جائی پن اور ستم شعار رویہ کا شکوہ کرتے ہیں۔۔۔ ہر شاعر۔۔۔ ہر محبت کرنے والا ان تجربات اور مشاہدات کو اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے۔ عامر بن علی نے اپنی غزلوں میں اسی عہد کا روزنامچہ لکھا ہے۔ دن رات کی آوارہ گردی، محبت کی مٹھاس، محبت کی لہجے کی تلخی اور اپنی ذات کی بے بسی کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ جو سرگوشیاں بن کر ہمارے کانوں میں سرسرا رہی ہیں۔''(۳۷)

جب ہم عامر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں محبت کی خوشبو ضروری نظر آتا ہے۔ جیسا کہ احمد عقیل روبی کی رائے ہے کہ انھوں نے اپنا محبت کا روزنامچہ تحریر کیا ہے۔ آج کے دور میں جیسے حالات ہیں۔ ان کو عامر نے لفظ عطا کیے ہیں جیسا کہ ہمیں ان کے اشعار میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

نفرتیں تو بڑھ گئی ہیں دوستی ملتی نہیں
اس نگر میں اب سنا ہے عاشقی ملتی نہیں(۳۸)

عامر بن علی کے ہاں عشق کی نعمت ہم انسانوں کے درمیان ختم ہو چکی ہے جو کہ دوستی، ہمدردی، محبت، ایثار اور انسانیت ہے لیکن یہ تمام چیزیں آج کے زمانہ میں ختم ہو کر رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے نفرت ہمارے معاشرے میں زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا عامر اس کا پرچار کرتے ہیں کہ محبت و عشق کو فروغ ملے اور آپس کی نفرتیں دور کریں۔

تجھے تجھ سے چرانا چاہتا ہوں
جنوں کو آزمانا چاہتا ہوں(۳۹)

عشق کو ایک کیفیت کہہ کر عامر اسے دیوانہ پن خیال کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کی بات ضرور کرتے ہیں، مگر ان کا

کڑھنا معاشرتی برائیوں پر مشتمل ہے۔ وہ اسی لیے گھوم پھر کر محبت و عشق کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔

آنسو بے خوابی اور سپنے ساجن کے
پیار کے در سے یہ نظرانہ آیا ہے
عشق کرو تب ہاتھ ہنر یہ آئے گا
ایسے ہی کب جان گنوانا آیا ہے
جیون ہار کے عاشق زندہ رہتے ہیں
دنیا سے یوں کسی کو جانا آیا ہے(۴۰)

یہ عام سی بات ہے جو عامر بن علی کے ہاں ہمیں خوب نظر آتی ہے کہ عشق اور محبت کے راستے میں مشکلات تو بہت ہوتی ہیں اور جو اس پر کار بند رہے گا وہی کامیاب ہوگا۔ وہ عشق کو ایک ہنر سمجھتے ہیں مگر اس میں جان کا جلنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ اُن کی اپنی کوئی زندگی نہیں رہتی اور نہ ہی اپنی کوئی خواہش باقی رہتی ہے۔ پھر عاشق اپنے محبوب کی خواہشات پر چلتا ہے۔ معاشرے میں سر تسلیم خم کر کے اپنے معشوق کے منہ سے نکلی بات کو پورا کرنے کی حتی الامکان نہ صرف کوشش کرتا ہے بلکہ اپنی جان تک نچھاور کر دیتا ہے۔ کیونکہ محبوب پر جان وارنا عاشق کا وطیرہ ہے اور دنیا اس کی سزا دیتی ہے۔

یہ سادہ دل کوئی بھولے سے جرمِ عشق کرے
بہت کڑی ہیں سزائیں ہماری بستی میں(۴۱)

عامر بن علی عاشق کے طرف دار ہیں کیونکہ ان کے نزدیک عشق کرنا کوئی بھرا نہیں ہے لیکن ہمارے معاشرے میں لوگ اس کا بھرم نہیں رکھتے، ایک عاشق کو عشق کرنے کی سزا ضرور ملتی ہے۔ عامر کے نزدیک نہ تو یہ جرم ہے۔ اگر کوئی عشق کرے تو ایک وقت کے لیے اسے ہم جرم سمجھ بھی لیں تو یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہوتا جتنی سزا ملتی ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ:

''شاعر کی نگاہ میں نشیمن اور اہلِ نشیمن میں صرف مکان و مکین کا تعلق نہیں ہوتا بلکہ نشیمن
اہلِ نشیمن کی کل کائنات ان کی دنیا ان کا سب کچھ ہوتا ہے۔''(۴۲)

عامر بھی ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھتے اور سوچتے ہیں۔ لہٰذا وہ عشق کو عبادت کا درجہ دینے میں بھی جھجکتے نہیں ہیں اور

کبھی کبھی وہ اس کا نیا اور انوکھا مفہوم بھی بتاتے ہیں:

عشق پیشہ پہ رکھتے ہیں ایمان
چاندنی اعتبار کی رُت ہے(۴۳)

---

عشق والوں نے کبھی ظلم پہ بیعت نہیں کی
ہم نے ہر دور کے جابر سے بغاوت کی ہے(۴۴)

یہ کوئی بڑی بات نہیں بلکہ ایک معاشرتی رویہ ہے کہ عشق کا راستہ خار دار راستہ ہے۔ گویا کہ عاشقی سختیاں جھیل جھیل مشکلات کا عادی ہو جاتا ہے۔ عامر اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ پھر ایک وقت جب آتا ہے تو عاشق ظلم کے خلاف سب سے پہلے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ظلم کو تسلیم نہیں کرتا۔

غم الفت ہے لاعلاج اگر
کیا کریں کے یہ چارہ کر جوگی
ہیر تنہا ہے جھنگ بیلے میں
رانجھا روگی بنا ادھر جوگی
عاشقی کا ہے حق یہی عامر
عشق جائے جو جائے سر جوگی(۴۵)

عاشق اپنے آپ کو مقتل میں پیش کر دینا تو مناسب خیال کرتا ہے مگر ظلم کے آگے اپنے آپ کو پیش نہیں کرتا۔ وہ اس کے خلاف آوازِ حق بلند کرتا ہے اور پھر ہمیشہ اسی راستہ پر چلتا جاتا ہے۔ گویا کہ یہ محبت عاشق کے لیے ایک طریقہ اور راستہ ہے۔ وہ چاہے اپنے خدا سے کرے یا وہ مخلوق خدا سے ہو۔ عامر ہر طرح کی محبت کے شوقین بھی ہیں اور آواز بھی بلند کرتے ہیں۔

''محبت بندے اور خدا کے درمیان بھی ہو سکتی ہے اور بندے اور بندے کے درمیان بھی۔ محبت کی اعلیٰ ترین صورت بندے کی خدا سے محبت ہے۔ اس محبت کو اپنے مختلف بالواسطہ اور بلاواسطہ مدارج میں عشق حقیقی کہا جاتا ہے۔ جبکہ بندے اور بندے کے

درمیان پُرخلوص اور جذباتی وروحانی رشتے کو عشق مجاز کا نام دیا جاتا ہے۔''(۴۶)

خدا تعالیٰ اپنے بندے کو عشق مجازی کے راستے سے پھرا کر عشق حقیقی تک لے جاتا ہے، مگر عامر ابھی عشق حقیقی کی وادیوں تک سفر کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ وہ خلق خدا اور محبوب سے عشق کی آواز بلند کرتے ہیں اور عشق کے اسی پہلے سبق پر ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر انسان اسی راستے پر پختہ ہو جائے اور اسی میں اپنے آپ کو تیار کر لے تو انسان کے لیے کوئی راستہ مشکل نہیں رہتا۔ یہاں مشکلات سے نبرد آزما ہو کر اصل ہمدرد بن جاتے ہیں۔

سنگ دل ہو کوئی یا مصلحت اندیش یہاں
پیار کی راہ میں دل سب کے پگھل جاتے ہیں(۴۷)

خدا تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا گویا کہ وہ پیار اور ہمدردی کے راستے پر چلتا رہے۔ عامر کے نزدیک یہ راستہ عشق ومحبت کا راستہ ہے۔ اس پر چلنا ضروری ہے۔

محبت ایک تہمت بن گئی ہے
بڑا مشکل زمانہ آ گیا ہے(۴۸)

محبت کے راستہ پر رہنا کامیابی ہے، مگر عامر کہتے ہیں کہ معاشرے اسے سمجھ نہ سکا اور اسے ایک غلط راستہ خیال کر چکا ہے۔ محبت کرنا ایک جرم ہے، ایک تہمت ہے، ایک برائی ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

رنگ اب کے نیا سا ہے دل میں
عشق مہماں ہوا سا ہے دل میں
لہریں پہلے بھی کتنی اٹھی تھیں
آج طوفان اُٹھا سا ہے دل میں(۴۹)

عامر اپنے اس خیال کو یوں بھی پیش کرتے ہیں:

محبت ان دنوں ارزاں ہوئی ہے
مجھے یہ عشق تو مہنگا پڑا ہے(۵۰)

عشق کے راستے پر ایک عاشق کو جو مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے عامر بار بار ان کا ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عامر

بن علی کے ہاں یہ ذکر ایک مثبت رویہ ہے اور عشق و محبت بھی مثبت سوچ ہی کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ وہ لوگوں کو خطاب کرتے ہیں کہ آپ انسانو! محبت کرو، مگر یاد رہے کہ اس محبت کے راستے میں مشکلات بہت ہیں۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں(۵۱)

عامر کا لہجہ کبھی کبھی غالب سے ملتا نظر آتا ہے۔ یہاں غالبؔ عاشق کی ایک گری ہوئی تصویر پیش کرتے ہیں تو عامر کے ہر ہر شعر میں ہمیں عاشق مظلوم و محروم نظر آتا ہے۔ گویا کہ عامر بن علی روایت سے دور نہیں ہیں۔ عشق و محبت کا نظریہ بہت پرانا ہے۔ عامر اس کو ایک نئے انداز میں پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مت کرو عاشق جو ڈرتے ہو
دل لگی بزدلوں کا کام نہیں
عشق رندوں کو سرفراز کرے
بے خود زاہدوں کا کام نہیں(۵۲)

عشق کے راستے پر چلنے کے لیے ایک بڑا دل درکار ہے۔ عامر عشق و محبت کو بہادروں کا کام گردانتے ہیں۔

تو لاکھ دے گی صدائیں مگر نہ پلٹوں گا
نصابِ عشق کو اک ضابطہ بنا دوں گا(۵۳)

عامر بن علی عشق ایک طریقہ کو بیان کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں اس راستہ کی تشریح موجود ہے۔ وہ لوگوں کو اس کی توضیح درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ طریقہ جو لوگوں نے اپنایا ہے۔ وہ درست نہیں ہے۔ اور وہ طریقہ عشق و محبت کو برا یا جرم سمجھنا ہے۔ عامر کے ہاں اس کا اقرار نظر آتا ہے کہ لوگوں کو عشق و محبت کا صحیح اور درست مفہوم سمجھایا جائے۔

یہ کیا ہے محبت یہ کیا ہے جوانی
عجب داستاں ہے انوکھی کہانی(۵۴)

---

عشق اپنا اصول ہے پیارے

باقی سب کچھ فضول ہے پیارے(۵۵)

عامر بن علی کی شاعری بعض دفعہ خطابیہ انداز میں نظر آتی ہے۔اور وہ بجا طور پر اس چیز کا اقرار کرتے ہیں کہ میں عشق کے راستے پر چلتا ہوں اور یہ راستہ بہت اچھا ہے۔یہی میرا اصول ہے۔میں اس سے دور نہیں ہٹ سکتا۔وہ ان کو سرگوشیاں قرار دیتے ہیں۔

''خواب اور یادیں میرے لیے زندگی کا صرف ایک حصہ نہیں بلکہ خود زندگی ہے۔
حقیقت کی دنیا میں رہتے ہوئے خوابوں اور یادوں کی سرگوشیاں جو میں نے سنیں پیش
کر رہا ہوں۔''(۵۶)

یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے اردگرد کے ماحول میں جو محسوس کرتا ہے وہی بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اور شاعر اس کائنات کا وہ حصہ ہے جو محسوسات اور تخیلات میں رہتا ہے گویا کہ وہ جب بھی اپنے خیال کو لفظ دے گا وہ مشاہدات، تجربات اور احساسات پر مبنی ہوگا اور وہ انہی معاملات میں خود کو رکھتے ہوئے کڑھتا اور الجھتا رہتا ہے۔لیکن کبھی کبھی وہ کڑھنے کے بجائے وہ انہیں الفاظ دیتا ہے۔

محبت میں ملے صدمے تو اپنے دل پہ جھیلیں گے
کسی سے کچھ نہ کہنے کا چلو اقرار کرتے ہیں
زمانہ تو ہمیشہ سے ہی دشمن ہے محبت کا
زمانے کو بدلنے کا چلو اقرار کرتے ہیں(۵۷)

عامر بن علی بھی جذبات کا اظہار کرتے ہیں مگر ان کے مشاہدات و تخیلات میں معاشرے کے اندر محبت کو اچھا تاثر دکھائی نہیں دیتا۔وہ اپنے اشعار میں اس روایت کو تبدیل کرنے کا اقرار کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

پیار کر لیں تو آہی جاتا ہے
درد سہنے کا حوصلہ رکھنا(۵۸)

---

ختم ہی نہیں ہوتا سلسلہ عذابوں کا

یہی لطف ہے ہمدم پیار کے نصابوں کا
زخم دل چھپا کر بھی کس طرح گنیں ہمدم
پیار میں نہیں ہوتا ضابطہ حسابوں کا(۵۹)

عامر کی شاعری بار بار ہمیں اس پیرائے میں نظر آتی ہے کہ وہ محبت کے راستے پر مشکلات کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے ہاں ان مشکلات سے گھبرانے والا اس راستے کا مسافر نہیں ہوسکتا اور نہ ہی وہ یہاں چل پائے گا یہ تو تنگی مصیبت اور غم کا راستہ ہے۔

''عامر بن علی کومل، معصوم اور سچے جذبوں کو سادگی اور سلاست کے ساتھ شعری پیکر عطا کرنے کے خوابیدہ عمل میں سرشار ہیں ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی لطافت اور نغمگی ہے جو قاری یا سامع کے دل و دماغ پر پھوار کی طرح برستی ہے اور پھر دھیمے دھیمے انداز میں سلگاتی چلی جاتی ہے۔''(۶۰)

عامر بن علی اپنی بات سادگی سے تو کرتے ہیں مگر ان کے ہاں یہ سادگی روزمرہ سے جڑی نظر آتی ہے تاکہ وہ اپنی بات زیادہ اچھے طریقے سے لوگوں کو سمجھا سکیں اور وہ بات عام سی نظر آتی ہے مگر ہمارے اس انسانی معاشرے میں بہت ہی اہم معاشرتی برائی ہے گویا کہ عامر بن علی کے ہاں عشق و محبت کا تصور ایک روایتی سا ہے مگر اس روایت کو بہت حد تک درست کرنے کی ضروری ہے۔ اور عامر انہی کو درست کرنے کی بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

## تصورِ زندگی

ایک انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی زندگی کی حقیقت، اور کائنات کے مطالعہ پر توجہ ضرور دیتا ہے۔ وہ خواہ دانستہ ہو یا نادانستہ، مگر وہ اس پر توجہ ضرور دیتا ہے۔ عامر بن علی بھی اپنی شاعری میں زندگی کا تصور ضروری رکھتے ہیں۔ وہ جس معاشرے کا حصہ ہیں وہاں بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے معاشرے کی برائیاں جوان کی زندگی پر براہِ راست اثر انداز ہو رہی ہیں ان کا احاطہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی غم ان کی زندگی ہیں۔ جن کو وہ زندگی کا حصہ بھی شمار کرتے ہیں لیکن زیادہ تر عامر کے ہاں ہمیں یہ غم زندگی کا حصہ نہیں بلکہ خود زندگی ہی ہے۔

طویل غم ، شب تنہائی ، اور تاریکی

کتابِ زیست کا جو انتساب دیکھا ہے(۶۱)

عامر کی اپنی زندگی غموں سے دوچار ہے۔ وہ تاریکی میں سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں جس کا اظہار ہمیں ان کی شاعری میں برملا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو انہی غموں کے نام کیے ہوئے ہیں۔ یہ علامتی انداز اپنا کر زندگی کو غموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان تمام غموں میں سب سے بڑا غم ہر شاعر کی طرح ان کے ہاں بھی محبوب کا غم ہے۔

تیرے بعد ایسی ہے زندگی
نہ خوشی نہ کوئی ملال ہے(۶۲)

---

جلتے ارمان کی چتا دیکھی
ہم نے بھی غم کی انتہا دیکھی
پھر وہ انداز تیرا غیروں سا
آج پھر زندگی سزا دیکھی(۶۳)

عامر کی زندگی میں بار بار محبوب کا غم نظر آتا ہے۔ پھر وہ زندگی کو ایک سفر گردانتے ہیں۔ کیونکہ زندگی میں ان کے ارمان مکمل ہوئے نہیں لگتے۔ زندگی ان کے لیے جہنم بن کر رہ گئی ہے۔ وہ غموں میں جل جل کر زندگی کی خوشی کو بھول گئے ہیں۔ اسلم کولسری کے مطابق:

> ''عامر بن علی کی شاعری کومل جذبوں کے سادہ اظہار سے عبارت ہے، مگر ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے باقی سب کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں۔ وہ کبھی کبھی باہر بھی جھانکتے ہیں۔ کڑھتے ہیں اور کہیں کہیں ایسا شعر بھی ان کے قلم سے چھلک جاتا ہے جو دنیا اور اہلِ دنیا پر ایک دردمند تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے تاہم ایسی صورت میں بھی ایک دبی دبی سسکی کی سی کیفیت ہوتی ہے۔''(۶۴)

عامر کی شاعری غموں میں تو ہے مگر ان کے ہاں زندگی ہنسی خوشی کا نام نہیں وہ زندگی کو کوئی اچھی چیز خیال نہیں کرتے وہ اپنی سسکیوں میں زندگی کا غم ضرور بیان کرتے ہیں، مگر وہ زندگی سے دلبرداشتہ نہیں ہیں وہ زندگی کو خوبصورت بنانا چاہتے ہیں۔

چھوڑ دنیا کی فکر آج کی رات
آج ہم دل کی بات کرتے ہیں(۶۵)

---

اک محبت ہی جرم تھا اپنا
عمر گزری ہے زخم سینے میں(۶۶)

زندگی دکھوں اور مصیبتوں کا نام تو نہیں مگر عامر کہتے ہیں کہ ہم نے زندگی کو دکھوں اور غموں والی بنا دیا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں ان سے نکل کر زندگی خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہونا چاہیے اور یہ خوبصورتی ان کے ہاں صرف اور صرف محبوب ہی کے ساتھ ہے۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کا محبوب ان کو میسر نہیں ہے۔ اگر محبوب میسر آ جائے تو زندگی بھی خوش گوار ہو جائے۔ وہ اسے خوشگوار بنانے کی آواز ضرور بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ خوف کے پہرے میں خوشی تلاشنا ان کی زندگی کا اصل الاصول ہے۔

شہروں شہروں دیس میں خوف کا پہرہ ہے
کہتی ہے سرکار یہ دور سنہرا ہے(۶۷)

ہر دور میں ظلم و ستم ضرور رہا ہے، مگر زندگی میں ان کو ختم کر کے ہی زندگی خوبصورت بنائی جا سکتی ہے۔ عامر کہتے ہیں کہ ہر کوئی ان کو ختم کرنے کی بات تو کرتا ہے، مگر یہ ختم نہیں کرتے۔

تم سے شکوہ نہ زمانے سے شکایت کی ہے
ہم ہی مجرم ہیں کہ اس دور میں چاہت کی ہے(۶۸)

عامر کے مطابق زندگی خوشیوں کا نام ہے۔ زندگی میں خوشیاں لا کر ہم زندگی کو خوبصورت بنا سکتے ہیں۔ گویا کہ وہ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ زمانے اور زندگی سے شکوہ کرنے کے بجائے انسان خود اندر سے اپنے آپ کو درست کرے۔ اپنی زندگی میں شامل اپنے طریقہ کار پر نظر ثانی کرے۔ کسی کو غلط کہنے کے بجائے پہلے خود کو دیکھے۔ جب وہ خود کو درست کرے گا تو اس کی زندگی بھی خود بخود اچھی اور خوشیوں بھری ہو جائے گی گویا کہ عامر اپنے آپ کو مجرم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک وقت، زندگی اور کوئی دوسرا غلط نہیں ہے۔

بکھری ذات کے حصے لے کر جینا ہے
اب ماضی کے قصے لے کر جینا ہے
نئی نئی اس بستی کے بازاروں میں
وہی پرانے سکے لے کر جینا ہے(۶۹)

زندگی میں نت نئی ایجادات اور طریقے رونما ہوتے ہیں، مگر باقی سب کچھ تو نیا ہے مگر عامر کے نزدیک زندگی کے غم وہی پرانے ہیں۔ گھر بار اور ساز و ساماں تو نیا ہی مگر انسانوں کے رویے، معاشرتی برائیاں اور انسانی کردار وہی پرانے ہیں۔

جو پیار کے رستے میں جھیلے وہ کرب عذاب بھی لکھیں گے
منزل پہ پہنچ جائیں ہمدم رستوں کا حساب بھی لکھیں گے(۷۰)

عامر اپنے اسی خیال کو مزید یوں بھی بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

ہم نہیں چاہتے یہ پھر بھی بدل جاتی ہے
زندگی جیسے کرائے کا مکان ہوتا ہے (۷۱)

وہ زندگی کو وقت سے تعبیر کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وقت بدلتا ہے، گویا کہ زندگی بھی وقت کی طرح کروٹیں بدلتی رہتی ہے اور یہ وقت یعنی زندگی عامر کے ہاں آخرت میں جا کر ختم ہو جائے گی۔ گویا وہ آخرت پر یقین ضرور رکھتے ہیں جسے وہ سزو جزا کا دن گردانتے ہیں۔

ہجومِ شہر سے کٹ سا گیا ہوں
میں دنیا سے بہت اکتا گیا ہوں(۷۲)

عامر بن علی زندگی سے اُکتائے تو ہیں مگر جس وجہ سے وہ یہ اثر رکھتے ہیں۔ اسے بھی ہر صورت ختم کرنے کا اعادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں ایک وجہ محبوب سے علیحدگی ہے اور عامر کے نزدیک اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ رہنا ہی اصل زندگی ہے۔

ٹھہری تھی مشکلوں سے طبیعت ابھی ابھی
طوفان زندگی کو نیا کون دے گیا(۷۳)

یہ زندگی بھی عجب بلا ہے
عجیب خوابوں کا سلسلہ ہے
کبھی کبھی تو لگے ہے ایسے
کہ زندگی کوئی اپسرا ہے(۷۴)

انسان کی زندگی میں بہت سارے غم بھی ہیں اور خوشیاں بھی۔ان میں انسان کے ہاں کچھ خواب ہوتے ہیں۔عامر کے نزدیک اصل میں یہی خواب تو زندگی ہے۔اگر انسان کے پاس خواب نہیں ہیں گویا کہ اس کی زندگی خوبصورت اور اچھی نہیں ہے۔ایک خوشحالی انسان میں خواب دیکھتا ہے۔مگر کبھی کبھی وہ اپنا انداز بولتے نظر آتے ہیں:

دکھ ہے ہیں زندگی کا حصہ مان لو
زندگی کو مسکرانا چاہیے(۷۵)

عامر بن علی کے ہاں زندگی کا تصور کوانوکھی اور ندرت والی شے نہیں ہے۔وہ زندگی کے بارے عام اور سادہ سی باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مگر ایک نصیحت آموز لہجہ اپنا کر زندگی کو غم کا نام بھی دیتے ہیں اور کہیں کہیں زندگی دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ خوشی کا نام بھی گردانتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انسان سب کے درمیان رہے،اکٹھے مل کر معاشرے بنائے تو انسان کو غم کم ملیں گے اور یہی ان کے نزدیک اصل زندگی ہے۔گویا عامر کے نزدیک زندگی بنانا خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

## تصورِ حسن و جمال

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو حسن والا پیدا کیا ہے۔مگر انسان کی اپنے ہاں بہت سی اقدار بنائی گئی ہیں۔وہ کچھ چیزوں کو اچھا اور خوبصورت سمجھتا ہے جبکہ کچھ کو بدصورت اور بری۔یہ انسان کی اپنی سوچ ہے جیسی وہ سوچ ہوگی انسان کے لیے وہ چیز بھی ویسی ہی ہوگی۔اگر وہ کسی کے بارے اچھا گمان رکھے تو انسان کو وہ شے اچھی،خوبصورت اور بھلی معلوم ہوتی ہے۔اسی طرح اگر وہ کسی شے کے لیے اچھا گمان نہ رکھے تو وہ شے اگرچہ خوبصورت ہو لیکن اس انسان کی سوچ کی وجہ سے وہ اسے بری لگنا شروع ہو جاتی ہے۔

''اللہ تعالیٰ کے جمال کو جملہ دیگر اشیاء کے مقابلہ میں زیادہ تکمیل کے ساتھ اپنے اندر
منعکس کرنے والی ہستی پھر انسان کی ہے۔ اگر چہ حسن انسان تک محدود نہیں۔''(۷۶)

حسن تو خدا تعالیٰ ہی سے چلا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اسے آگے انسان کو منتقل ضرور کیا ہے۔ وہ چاہے کوئی بھی شے ہو اس کا اصل حسن خدا کے ہاں ہے۔ یہاں خدا کی عطا کردہ صنف ہے۔ اور پھر اسی عطا سے انسان اپنے اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لیے بہت کچھ بناتا چلا جاتا ہے۔ گویا کہ انسان خام اشیاء کو خوبصورتی سے نوازتا ہے۔ جس سے اس معاشرے کا حسن و جمال پہلے سے کہیں زیادہ ہو جاتا ہے۔

تمہاری آنکھ میں دیکھی ہے موتیوں کی لڑی
تمہارے چہرے کو بکھرا گلاب دیکھا ہے(۷۷)

عامر بن علی کے ہاں حسن کا تصور محبوب کی خوبصورتی سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ محبوب مجازی کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اس حقیقی محبوب کے حسن کی تعریف بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانوں کی شکلوں اور صورتوں ہی میں اصل خوبصورتی چھپی ہے۔ جن کو دیکھ کر انسان خوش ہوتا ہے۔

اس کے چہرے کی دمک سے شہر میں تھی روشنی
اس قدر جو مہربان ہو چاندنی ملتی نہیں(۷۸)

حسن کسی خزانہ اور روپیہ پیسہ کی طرح ہے اور عامر حسن کو چاندنی سے بھی مستعار لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چمکدار صاف و شفاف ہے۔ گویا عامر یوں اقرار کرتے ہیں:

کوئی تجھ سے نہیں دنیا میں
میں نہیں سارا شہر کہتا ہے(۷۹)

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ حسن کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اس کی راہ میں مشکلات بھی آتی ہیں۔ مگر وہ ان سے گھبراتا نہیں ہے۔ عامر اس چیز کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ حسن کے اندر وہ کشش ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ عامر اسی حسن کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ مجاز ہے یا حقیقی۔ حسن بہر حال حسن ہے وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔

رزم گاہوں میں کٹا کرتی ہے شاہوں کی حیات

حسن والوں نے اداؤں سے حکومت کی ہے(۸۰)

عامر بن علی اپنے ہاں اس انداز کو ان الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

اپنی ساری عمر کٹی ہے حسن اور عشق کی راہوں پر
ان رستوں پہ دل ہے رہبر دل تو دھوکا کھائے گا(۸۱)

عامر کو عشق کی راہوں پر چلنے میں مزہ آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کو عشق کی راہوں پر حسن کھینچ لاتا ہے۔ لہٰذا وہ عشق کی راہوں پر حسن کے پیچھے پیچھے ہیں۔ گویا ان کا اپنا راستہ کچھ نہیں وہ عقل و خرد کو کھو بیٹھے ہیں اور زمانے کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ان راہوں میں انسان کی جان تک چلی جاتی ہے، مگر یہ حقیقت تک ضرور لے جاتا ہے۔ یہاں عامر ہمیں خبردار بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ یہاں دھوکہ ہونے کا ڈر بھی بہرحال موجود ہے۔ ان راستوں میں انسان فکر و سوچ سے عاری ہوتا ہے۔ اس لیے دھوکہ کھانا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی اور انسان قدم قدم پر فریب میں آجاتا ہے۔

الجھے ہیں بہت دنیا میں ابھی مل جائے ہمیں مہلت تھوڑی
اس حسن دلاور کی دھج پر اک روز کتاب بھی لکھیں گے(۸۲)

عامر کے ہاں حسن ایک پسندیدہ راستہ ہے جہاں وہ ایک اچھا تجربہ ہوتا محسوس کرتے ہیں لیکن وہ یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ انسان تو دنیا میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ دنیا اور حسن کا موازنہ بھی کرتے ہیں۔

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے(۸۳)

عامر حسن کو ایک فنا ہونے والی شے سمجھتے ہیں۔ وہ اس کا موزانہ حکومت سے کر کے سوالیہ انداز اپناتے ہیں۔ ایک انسان یا ایک شے کو ہمیشہ ہی حسن نہیں رہتا۔ حسن کو ایک نہ ایک دن زوال ضرور آتا ہے۔ جیسے کہ حکومت ایک نہ ایک دن ختم ہوتی ہے۔ اسی طرح حسن بھی ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ عامر یہاں خطابیہ انداز اپنا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حسن صدا نہیں رہنے والا لہٰذا اس کو دائمی نہ سمجھا جائے یہ ایک دن فنا ہو جاتا ہے۔

## تصورِ درد و غم

انسان اس کائنات میں رہتے ہوئے مختلف کام سرانجام دیتا ہے۔ لہٰذا ان مختلف معاملات میں وہ خوشی غمی سے گزرتا

ہے۔کبھی تو انسان کو خوشی ملتی ہے اور کبھی غمی سے دوچار ہوتا ہے۔اردو شاعری میں یہ جذبات عام ہیں کہ شاعر ایک عاشق کی تصویر میں غموں سے گزرتا ہے۔عامر بن علی کی شاعری بھی اسی کا ایک حصہ لگتی ہے جس میں عامر مختلف غموں سے اپنے آپ کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے ہاں سب سے بڑا غم محبوب کا غم ہے۔ان کا محبوب ان سے بے وفائی کرتا ہے جس سے وہ نالہ بھی ہیں اور غم زدہ بھی۔ادیب رضوی رقم طراز ہیں:

> ''ہماری شاعری میں رنج وغم کے مضامین کی کثرت کا اصل سبب یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے متعلق ہمارے شاعروں اور ان کے عہد کے مفکروں کا نقطہ نظر باسی یا قنوطی تھا۔اس کے علاوہ جس شاعری کی بنا کسی قوم کے نتزل کے ساتھ پڑی ہو اور جس کا عروج قومی زوال کے ساتھ ساتھ ہوا ہو اس کی حالت اور کیا ہو سکتی ہے ابھی زوال کے آثار مٹ نہیں چکے ہیں۔اور بدحالی کا رونا ختم نہیں ہو چکا ہے، مگر اب ضرورت ہے ایسے شاعروں کی جو خود ہنس کر دوسروں کو ہنسائیں۔''(۸۴)

عامر بن علی کے ہاں غم سے چھٹکارا ناممکن سی بات ہے۔اسی لیے وہ بار بار غموں والی بات کرتے دکھائی دیتے ہیں گویا کہ غم انسان کی زندگی کا لازمی امر ہے مگر اس پر صبر وشکر سے چلنا ہی بڑی عقل مندی ہے۔عامر کہیں زندگی میں غموں سے دوچار ہو کر پھر بھی خوش ہی دکھائی دیتے ہیں۔کیونکہ ان کو زندگی پیاری لگتی ہے تو زندگی کے دیے غم بھی اچھے لگتے ہیں۔اس لیے ان کو ان غموں میں مزہ آیا ہے۔اسی لیے وہ شکوہ نہیں کرتے۔

زندگی کے دشت میں ہے کرب کا اپنا مزہ
درد کا اپنا مزہ ہے ضبط کا اپنا مزہ(۸۵)

یہاں پر عامر بن علی غالب کے نقش قدم پر چلتے نظر آتے ہیں۔جن کو غم سہنے میں ایک سرور ملتا ہے۔خدا تعالیٰ غموں میں بھی شکر کرنے والے اور خوش رہنے والے انسان سے خوش ہوتا ہے۔اور ان کے اس عمل پر انہیں پہلے سے زیادہ خوشی دیتا ہے۔

برستی آگ ہے چاروں طرف آہ فغاں
تمہارے بعد جو شہر خراب دیکھا ہے(۸۶)

آگ برسنا ایک محاورہ ہے۔یعنی غموں کا ملنا، عامر محارتاً بات کر کے بتاتے ہیں کہ ان کی زندگی میں غم ہی غم ہیں اور صرف اور صرف محبوب کے جانے سے۔کبھی کبھی وہ یوں بھی سوال کرتے ہیں:

مجھے بتا تو سہی تو کہ سوگوار ہے کیوں
جو ہنسا رہتا تھا چہرہ وہ اشکبار ہے کیوں
تجھے جو غم ہے تو مجھ کو بھی بتا ہمدم
نہیں ہے زخم کوئی بھی تو بے قرار ہے کیوں(۸۷)

عامر کا محبوب چونکہ خوش وخرم ہے اس لیے عامر اس سے کبھی جو غم میں آئے تو اس غمی سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ان کے نزدیک غم تو عاشقوں کی چیز ہے۔نہ کہ یہ معشوقوں کی۔لہٰذا وہ محبوب کو پریشان دیکھ کر اپنے دل میں ایک نیا غم لیتے ہیں۔

تیری یاد کے اُجڑے خیمے جلتے ہیں
نئے بہانے درد پرانا آیا ہے(۸۸)

عامر کی زندگی میں سب سے بڑا غم جو اس کا محبوب ہے۔جب انسان کا محبوب پاس ہو تو غم کی کیفیت کچھ اور طرح کی ہوتی ہے جبکہ محبوب کے جانے کے بعد اس کے غم میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔اور اس کی کیفیت یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔عامر کے ہاں بھی ہمیں یہی انداز نظر آتا ہے۔جیسے ان کا محبوب پاس ہو کر اور طرح کا غم دیتا ہے۔جبکہ بچھڑنے اور دور جانے کے بعد اس کا غم تبدیل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔لہٰذا وہ اسی کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں:

اے مرے دل رہین رنج و الم
تیرے صبر و قرار کی رُت ہے
جو ہوا اس کا غم تو ہے لیکن
آج غم سے فرار کی رُت ہے(۸۹)

غم انسانی دل پر ڈیرہ ڈال لینے کے بعد انسان کو کسی طرح کا نہیں چھوڑتا۔عامر بھی اپنے دل کو داد وتحسین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان کا دل غم سہہ سہہ کر بہت مضبوط ہو گیا ہے۔گویا انسان اگر خندہ پیشانی سے غموں کا مقابلہ کرے تو وہ زندگی کی مشکلات کو آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔

جانے والوں کا غم نہیں مٹتا
ٹوٹے صد ہزار کرتا ہوں
ہو بھی سکتا ہے تو پلٹ آئے
دل کو یوں بے قرار کرتا ہوں(۹۰)

عامر کی شاعری میں ہمیں مختلف طرح کے غم کا اندازہ ہوتا ہے۔ عامر غموں کی اقسام بیان کرتے ہیں۔ محبوب کے پاس ہونے کا اور غم ہے جبکہ اس کے دور جانے کا غم اور طرح کا ہے۔ لیکن عامر اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ اگر انسان کا محبوب یا وہ اچھی چیز جسے انسان پسند کرتا ہے وہ اگر انسان کو مل جائے تو انسان کے دل کا بوجھ کم ہوسکتا ہے۔ اور غم مٹ جاتے ہیں۔

لوگوں کے غم سنتے سنتے دل پتھر ہو جائے گا
ساری دنیا گھوم چکے ہیں جانے گھر کب آئے گا
دل کی بستی ایسی اُجڑی خاک اُڑے ہے یادوں کی
کب برکھا کی آمد ہوگی کیا آنچل لہرائے گا
بات ہے سیدھی مان لو سادھو بے دردوں کی نگری ہے
جو بھی من کی بات سنے گا یہاں وہ غم ہی پائے گا(۹۱)

اب عامر کے ہاں غم کی تیسری قسم لوگوں کے غم ہیں جو ایک انسان خود اپنے اوپر طاری کرتا ہے۔ یا معاشرے میں رہتے ہوئے دوست احباب کے غم سنتا ہے لیکن ان کے ہاں خوشی کی امید ضرور ہے۔

ہمیں یہ ڈر ہے کسی دن وہ جاں بھی لے لے گا
یہ زہر غم جو ہماری رگوں میں پلتا ہے
کہیں بھی چین نہیں ہے بچھڑ کے یاروں سے
سکوں کی کھوج میں من جا بجا بھٹکتا ہے(۹۲)

وہ غموں میں تو ہیں مگر ان غموں میں ان کو ایک خوشی ملنے والی امید ضرور جھلکتی ہے۔ لیکن اسی خوشی کی امید میں وہ غم کی چوتھی قسم بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ غم جیسا بھی دل میں ہو وہ اندر سے دل کو زنگ کی طرح کھائے جاتا ہے۔ اور وہ انسان کو

ایک دن مار دے گا۔

یہ تو وہ منظر نہیں جس کا تھا ہم کو انتظار
زخم سارے کھل اُٹھے غنچہ نہیں کوئی کھلا(۹۳)

عامر کہیں کہیں اپنا غم ان الفاظ میں بھی بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

زخمی سوچ اور ٹوٹے دل پہ اشک زدہ
یار جو میرے درد بٹانے آیا تھا
دروازے پہ دستک جانے کس نے دی
درد پرانا نئے بہانے آیا تھا(۹۴)

عامر جتنا زیادہ غموں سے اپنا پیچھا چھڑاتے ہیں غم اتنا ہی زیادہ ان کے پاس بھیس بدل بدل کر آتے ہیں۔ اُن کا غم وہی پرانا ہے مگر اس کا انداز اب کے بار کچھ نیا ہے۔ یہاں عامر کو غم کا کھٹکا تو دل میں ستاتا ضرور ہے مگر ایک نیا غم آنے کے اندر خوشی کی امید بھی چلی آتی ہے کیونکہ وہ غم میں اپنے محبوب کی یاد میں ہیں۔ محبوب میسر آئے تو خوشی مل جائے۔ ان کا یہ کھٹکا بہت ہی نمایاں ہے:

کیسا غم ہے جو ہر اک روز بڑھا جاتا ہے
وقت کے ساتھ سنا تھا کہ سنبل جاتے ہیں(۹۵)

یہاں عامر غم کی ایک قسم سے متعارف کراتے ہیں جو غیر بیل کی طرح ہے اور روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے حالانکہ عامر تو یہ خیال کرتے ہیں کہ غم تو ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

''یوں تو اکثر شعر عاشقانہ شاعری میں شباب ہی کی باتیں کرتے ہیں مگر غور کیا جائے تو
ہر ایک کا رنگ مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے بھی کہ محبت کے بارے میں احساس یا سوچ
مختلف ہوتی ہے۔ مگر اس لیے بھی کہ ہر شاعر کی شاعری ایک خاص دورِ عمر بھی منعکس ہوتا
ہے کسی کے یہاں آمدِ شباب کسی کے یہاں عنفوانِ شباب کی باتیں ہوتی ہیں۔''(۹۶)

عامر کے غم میں بھی مماثلت نظر آتی ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی مسائل ہیں جن کی طرف ڈاکٹر سید عبداللہ نے اشارہ

کیا ہے۔اور وہ صرف اور صرف اپنے محبوب ہی کا غم رکھتے ہیں جو ان کی شاعری میں ہمیں بخوبی نظر آتا ہے۔گویا کہ عامر کے نزدیک سب سے بڑا غم انسان کے پاس اس کے محبوب کا غم ہے۔

آخر شب وفا پہ اس کا بیاں
سارا غم حرفِ کاش میں نکلا(۹۷)

عامر یہاں غم کا بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں وہیں غم کی تسلی بھی نظر آتی ہے۔یہاں ان کے ہاں غم کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ لفظ کاش ہے۔وہ کاش کے اندر اپنی ساری حسرتیں پوری کر لیتے ہیں لیکن یہ کاش کا لفظ بھی ہمیں محبوب کی جدائی ہی میں نکلتا دکھائی دیتا ہے۔

بچھڑ جانا اگرچہ طے شدہ تھا
ترے جانے کا پھر بھی دکھ بڑا ہے
زمانے کے سبھی غم دے کے مجھ کو
مجھے وہ پوچھتا ہے کیا ہوا ہے(۹۸)

درد و غم کا تعلق محبوب سے ہے لیکن اس کے علاوہ اس زندگی اور معاشرے سے بھی براہِ راست جڑا ہوا ہے۔گویا کہ عامر کے ماطبق انسان کے لیے درد والم کا ذریعہ معاشرہ اور اس کا محبوب دونوں ہیں۔

مرے پہلو میں لاکھوں غم بھی اکثر سوئے رہتے تھے
یہ کیسا سانحہ آیا اداسی کم نہیں ہوتی(۹۹)

عامر کے ہاں ان کی شاعری میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی بھی صورت غموں کی دولت سے الگ نہیں ہوتے۔دن ہو یا رات، پہر ہو یا گھڑی، گرمی ہو یا سردی غرض کے ہر حالت میں غم اور دکھ ان کا پیچھا کرتے ہیں۔وہ اس بیان میں یہ سبق دیتے ہیں کہ انسان ان غموں سے نہ گھبرائے۔

دریا میں بھنور کس کو مٹانے کے لیے ہے
کیا دل یہ مرا غم ہی اُٹھانے کے لیے ہے(۱۰۰)

عامر بن علی دریا میں بھنور سے غموں کو تشبیہ دیتے ہیں کہ دل میں جو غم بھنور کی طرح ہیں:

سنو میں مسکرانا چاہتا ہوں

غموں کو بھول جانا چاہتا ہوں
یہ دنیا تلخیوں سے بھر چکی ہے
نئی دنیا بسانا چاہتا ہوں(۱۰۱)

دل کے اندر غم بھنور بنے ہیں وہ ان میں اس قدر پھنسے ہیں کہ اب نکلنا محال ہے۔ وہ اب ان غموں سے آزاد ہو کر مسکرانا بھی چاہتے ہیں۔ اور ان دکھوں اور غموں کو ختم کر کے ایک نئی دنیا بسانے کے خواہاں بھی ہیں۔ جس میں ان کو دکھوں اور مصیبتوں سے نہ صرف خلاصی ملے گی بلکہ غموں سے بھی چھٹکارا میسر آئے گا۔ اسی لیے وہ بار بار غموں سے چھٹکارے کا ذکر کرتے ہیں تا کہ کوئی مسیحا آئے اور ان کے غم کو غلط کرے۔

## تصورِ محبوب

زندگی میں ہر انسان کو کوئی نہ کوئی شے خوبصورت ضرور لگتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کوئی انسان ہی ہے یا کوئی اور بے جان اشیاء یا کوئی کیفیت بھی۔ اس پسندیدہ شے کو اردو شاعری میں محبوب کہا جاتا ہے۔ لیکن کچھ محبوب مرد و زن میں بھی ہوتے ہیں۔ عامر بن علی کا محبوب بھی ہمیں ولی کی طرح رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سعد اللہ کلیم رقم طراز ہیں:

''ولی کی غزل میں سنبل ہو کر سرو و سمن موتی ہو کہ لعل و یمن، چشمۂ آب حیات ہو کہ بوئے ختن، رات کی سیاہی ہو کہ دن کا اُجالا۔ ہر شے کسی ایسے مشبہ کا مشبہ بہ ہے جو اپنے مجموعی بے حد و حساب کمالات اور صفات میں جزوی طور پر بعض اشیائے عالم وجود سے مماثلت رکھتے ہوئے کلی طور پر سب سے بلند و برتر ہے۔''(۱۰۲)

مندرجہ بالا الفاظ کی طرح عامر کا محبوب بھی نظر آتا ہے۔ وہ بھی خوبصورت ہے اور عمل ولالہ جیسا بھی اس کی یہ خوبصورتی عامر بن علی پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ جو ان کی شاعری میں ہمیں نمایاں نظر آتا ہے۔

دنیا کے تپتے صحرا میں
ساون کی تو جھڑی ہے ساجن
آنکھوں میں ماضی کے منظر
اور اشکوں کی لڑی ہے ساجن(۱۰۳)

یہاں عامر اپنے محبوب کو ساون کی جھڑی اور اشکوں کی لڑی سے استعارہ لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جو برستے ہیں تو پھر رکتے نہیں اور ہر شے کو گیلا کرتے یعنی ہر شے پر اپنا اثر ضرور ڈالتے ہیں۔ یہی خوبی عامر کے محبوب کی ہے۔ جو اپنا اثر ان پر بخوبی ڈالے ہوئے ہے۔

اس کے تن سے ہی تھی مرے من میں خوشی اس کے جانے کے بعد
اب کے تنہائیوں میں ڈوبا ہوا جی بہلتا نہیں(۱۰۴)

عامر کا محبوب ایک خوشی بھی ہے۔ جس کو حاصل کرنے کے لیے وہ تگ و دو بھی کرتے ہیں اور اس کوشش کا اظہار اپنی شاعری میں کرتے ہیں کہ محبوب کا ملنا خوشی کا ملنا ہے۔

اسی خیال میں گزری ہے آج کی شب بھی
یہ چاند آج بھی اترے گا تیری صورت میں(۱۰۵)

عامر بن علی اپنے محبوب کو چاند کی خوبصورتی سے ملاتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان کا محبوب بھی چاند کی طرح خوبصورت ہے اور چاند ان کے محبوب کی صورت میں واضح ہوتا ہے۔

لوگ تو اور بھی جیون میں بہت آئے ہیں
دل کی دہلیز کوئی چھو نہ سکا تیرے بعد
خوشی تو روٹھ گئی تھی ہنسی بھی بھول گئے
غم سے کچھ ایسا ہمیں پالا پڑا تیرے بعد
تجھ سے پہلے بھی رہا کرتے تھے شکوے جگ سے
من زمانے سے ہی بیزار ہوا تیرے بعد(۱۰۶)

ایک بچھڑنے والا انسان ہی زیادہ قریبی محسوس ہوتا ہے۔ عامر بھی اپنے بچھڑے محبوب کی یاد میں نظر آتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ان کا یہ انداز انہیں عشق مجازی کی بات سے عشق حقیقی کی طرف لے جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عشق مجازی میں وہ اپنے محبوب سے بچھڑنے کا اظہار کرتے ہیں جبکہ عشق حقیقی میں تیرے بعد کا لفظ نمایاں ہے کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف کر غبت اختیار نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس کے علاوہ انسان کا کوئی ہے۔

کچھ نہیں مانگتے ہم تیرے سوا دنیا سے
اور ہوں گے جو کھلونوں سے بہل جاتے ہیں
سانس کی ڈور ترے نام کی مالا ہے ہمیں
تجھ سے غافل ہوں تو ہم سوائے اجل جاتے ہیں(۱۰۷)

یہاں عامر بن علی عشق حقیقی والا ہی انداز اپناتے ہیں۔جس میں وہ دنیا سے الگ ہوکر صرف اور صرف دنیا سے اپنا محبوب ہی مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ایک چہرہ ایسا چھایا ذہن پر
من کو کوئی دوسرا بھاتا نہیں(۱۰۸)

یہ شعر خالصتاً عامر نے عشق مجازی میں لکھا ہوسکتا ہے،مگر عشق حقیقی کا پہلو ان کے ہاں اس میں بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے۔وہ اپنے محبوب کی صورت کے سوا کسی کی طرف نہیں دیکھتے کیونکہ ان کی آنکھ کو کوئی اور صورت اچھی ہی نہیں لگتی سوائے اپنے محبوب کے چہرہ کے۔

وہ میری روح میں کچھ اس طرح سمایا ہے
مرا وجود بھی لگتا ہے اس کا سایہ ہے(۱۰۹)

انسان کا وجود جسم اور روح کا تلازم ہے۔یہاں عامر خود کو روح کہہ کر اور اپنے محبوب کو جسم تصور کرتے ہیں۔ان کا اشارہ اپنے دنیاوی محبوب کی طرف تو بہر حال ہے مگر اس کے علاوہ اپنے خدا تعالیٰ اور اپنے نبیؐ کی طرف اشارہ بھی ہے کیونکہ جب عاشق کی ظاہر حالت اپنے معشوق سی ہو پھر وہ عاشق نہیں معشوق ہی نظر آتا ہے۔یہاں عامر کا بھی ہمیں یہی انداز نظر آتا ہے۔

تیری صورت سے جو ملتی کوئی صورت دیکھوں
پھر پری خانۂ دل میں وہی صورت دیکھوں(۱۱۰)

عاشق اپنے معشوق کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا اگر دیکھے بھی تو اسے ہر صورت اپنا محبوب ہی نظر آتا ہے۔عامر بن علی کی بھی یہی کیفیت ہے۔وہ بھی اپنے عشق میں اس قدر آگے جا چکے ہیں کہ اب ہر شے میں محبوب ہی کی صورت نظر آتی ہے۔کیونکہ

اسی کا خیال ہر وقت ہے۔

ایسے مل کر نہ جانے کیوں لگا یوں
وہ شیشہ سنگ جیسا ہو گیا ہے(۱۱۱)

عامر بن علی کے ہاں محبوب کا تصور نہایت ہی حسین و جمیل اور خوبصورت شے کا ہے۔ مگر وہ خوبصورت شے شیشہ تو ہے۔ اصل میں وہ اپنی اصلیت یا اپنے کردار سے ہٹ کر کام کرے تو تب وہ شیشہ نہیں بلکہ ایک پتھر بنتا ہے۔ عامر بھی اپنے محبوب کی بے وفائی پر اسے پتھر کہتے ہیں۔

## تصورِ موت

موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس میں دنیا میں آئی ہر ذی روح شے کو موت ایک نہ ایک دن آنی ہی ہے۔ اس لیے اردو شاعری میں بھی ہمیں اس کا عام ذکر نظر آتا ہے۔ عامر بن علی بھی اپنی شاعری میں موت کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر ان کے ہاں یہ ذکر ایک منفرد سا نظر آتا ہے۔

نہ رہ سکوں گا زندہ بچھڑ کے تجھ سے
کہے ہزار کوئی جی کے میں بتا دوں گا(۱۱۲)

محبوب سے ملنا موت ہی کے برابر ہے مگر عامر کا فلسفہ موت یہاں یکسر تبدیل ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ محبوب پر اگر جان نثار ہو جائے تو وہ مرتا نہیں بلکہ دائمی جاں وداں ملتی ہے۔ اسے کبھی موت نہیں آتی۔ وہ ویسے ہی زندہ ہے اور لوگ اسے یاد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

نگر نگر کا سفر بس اسی سبب سے ہے
نجانے کون سے بستی میں تیرا گھر ہو گا
رہِ وفا میں جو مقتل ہوا کبھی برپا
تو سب سے اونچا سناں پر مرا ہی سر ہو گا(۱۱۳)

عامر اپنے محبوب پر جان نچھاور کرنا ایک اچھا عمل گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبوب کے نام پر جان دینا عاشق کا وفادار ہونا ہے۔ وہ اپنے آپ کو وفادار ثابت کرتے ہیں۔ اور سب سے پہلے جان دینے کی بات کرتے ہیں۔ ان کی جان ان

کے محبوب کے مقابلہ میں کچھ زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ وہ اسے کے سامنے عام اور ہیچ ہے۔

عدل تو گھر کی باندی ہے ان شاہوں کی
موت کے بعد سنا ہے ایک کٹہرا ہے(۱۱۴)

عامر بن علی موت کا ذکر کرتے حضرت امام حسین کے گھرانے کا ذکر بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ انھوں نے بھی محبوب کے نام پر جان واری اور اس کا اجر بھی کوئی نہیں مانگا۔

ہمیں یہ ڈر ہے وہ کسی دن جاں بھی لے لے گا
یہ زہر غم جو ہماری رگوں میں پلتا ہے
اداسیوں کا مداوا نہ گر ضروری ہو
ترے بغیر بھی سانسوں کا کھیل چلتا ہے(۱۱۵)

جیسا کہ آخرت ہمارے ایمان کا حصہ ہے ایسے ہی عامر اس عقیدے پر مکمل طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک آخرت سزا و جزا کا دن ہے۔ وہ محبوب سے بچھڑ کر اپنی جان دینے کا کہتے ہیں اور پھر آخرت میں اُس سے اس کا حساب بھی مانگیں گے۔

دھڑکن سے جڑ گیا ہے بس اک نام اس طرح
میرے بدن سے روح کا رشتہ ہے جس طرح(۱۱۶)

---

مقتل ہی بنا ڈالا تو نے اس دیس کو اے جابر حاکم
جو عہد میں تیرے قتل ہوئے وہ بانکے خواب بھی لکھیں گے(۱۱۷)

یہاں عامر محبوب کے علاوہ جابر حکمران کو بھی قتل بیان کرتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک یہ دونوں جان لینے والے ہوتے ہیں۔ مگر دونوں کے قتل میں مکمل ایک فرق موجود ہے۔

وہ سولی پر بھی رنجیدہ نہیں ہیں
جنھیں وعدہ نبھانا آ گیا ہے(۱۱۸)

جیسا کہ قرآن نے موت کا فیصلہ کیا ہے کہ ہر ذی روح نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ عامر قرآن پاک کی اسی آیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جن لوگوں کو اس کی سمجھ آجائے وہ کبھی بھی اپنی جان دینے سے نہیں گھبراتے۔

زندہ رہنے کے لیے جیتا رہا تیرے بعد
شہر میں اپنا مگر جی نہ لگا تیرے بعد(۱۱۹)

محبوب سے بچھڑ کر مرنا عاشقوں کا خاصا ہے مگر عامر یہاں ایک نئی علت بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کو محبوب سے بچھڑنا پسند تو نہیں مگر وہ پھر بھی اسی پر اپنی جان نچھاور کرنے کے بجائے زندہ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، مگر محبوب کے بغیر ان کا یہ زندہ رہنا بھی کسی کھاتے میں نہیں ہے۔ وہ زندہ رہنے کی بات تو کرتے ہیں مگر اس سے گھبراتے بھی ہیں۔

## تصورِ وقت

وقت کا تصور ایک خیال اور سوچ کی مانند ہے۔ گویا کہ ہر انسان کے ہاں وقت کا تعین ضرور ہوتا ہے۔ وہ چاہے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر۔ عامر بن علی کی شاعری میں بھی ہمیں اس وقت کے مضامین سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ اور وہ بھی اپنے ہاں وقت کا تصور رکھتے ہیں۔

وقت سے ہار کے کیسے اندھیروں میں ڈوبے
قبروں پر کچھ دیپ پرانے دیکھے تھے(۱۲۰)

ایک انسان وقت کا مقابلہ نہ کر سکے تو عامر کے نزدیک وہ اندر سے ختم ہو جاتا ہے۔ عامر وقت کی قدر کرنے کا ایک نظریہ اپنے ہاں رکھتے ہیں۔ وقت اگر ہاتھ سے نکل جائے تو پھر وہ واپس نہیں آتا۔ عامر اس کی قدر کرنے کی تلقین اپنی شاعری میں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ٹوٹے سپنوں کو تم کیسے جوڑو گے
وقت کا دھارا تنہا کیسے موڑو گے(۱۲۱)

عامر بن علی کی شاعری میں کہیں کہیں وقت کو تبدیل کرنے کا ایک نظریہ ہمیں ضرور نظر آتا ہے۔ وہ اس طرف آواز بلند کرتے ہیں کہ ایک انسان معاشرے میں رہتے ہوئے دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر اس وقت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ

ناممکن بات نہیں ہے۔وقت گیا ہوا واپس آ سکتا ہے مگر وہ یہ بات بھی کرتے ہیں کہ:

گئے دن لوٹ کے آگے نہ کبھی
پھر بھی آواز دیے جاتے ہیں(۱۲۲)

انسان اپنی کوشش اور ہمت سے وقت کا دھارا ضرور بدل لیتا ہے لیکن اس کی کمی اور کام کو صرف پورا کیا جا سکتا ہے۔وہ وقت اور دن واپس نہیں لائے جا سکتے۔

وقت کے صحرا میں بچھڑ ہم سے جو پھر کب ملا
ہے یہی اندازِ فطرت کارواں سے کیا گلہ(۱۲۳)

---

ہے اس کے پاؤں میں زنجیر میری آنکھ میں اشک
یہ وقت نے ہمیں کس موڑ پر ملایا ہے(۱۲۴)

عامر وقت کا تصور محبوب کے ہجر و وصال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔محبوب کا نہ ملنا صرف اور صرف وقت کی وجہ سے ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ وقت انسان کو اچھے اور برے حالات دکھاتا ہے۔

وقت کے ساتھ تقاضے بھی بدل جاتے ہیں
ہاں مگر من کی وہی فرد ضرورت دیکھوں(۱۲۵)

جیسے جیسے وقت تبدیل ہوتا جاتا ہے تو انسان کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔لیکن جو ایک خاص قسم کی شے انسان کے دماغ میں چھائی ہے۔وہ کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتی۔عامر اسے محبوب کا نام دیتے ہیں۔

## تصورِ انسان

انسان کائنات کا مطالعہ تو کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ معاشرے میں اپنے جیسے انسانوں کی نفسیات اور سوچ و فکر کا مطالعہ بھی ضرور کرتا ہے۔عامر بن علی بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں وہ بھی لوگوں کی نفسیات کو دیکھتے ہیں اور ان کی خوبیاں اور خامیاں اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں:

مقتل میں جب چہروں ے اُلٹے پردے

سب قاتل جانے پہچانے دیکھے تھے
نگر کے سارے باسی ہی پتھر دل تھے
کانچ بدن نے لاکھ بہانے دیکھے تھے(۱۲۶)

عامر بن علی انسان کو دوسرے انسانوں کے لیے ہمدرد نہیں گردانتے بلکہ وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا قاتل تصور کرتے ہیں۔ان کے نزدیک کچھ نازک مزاج اور کمزور لوگ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں جن پر دوسرے بڑے طبقے کے لوگ ظلم وستم کرتے ہیں۔ان کے دل تو پتھر کے ہیں۔

لوگ وفا سے بے بہرہ ہوں جس کوچے کے
مورکھ من ایسی بستی میں جاتا کیوں نہیں(۱۲۷)

اس معاشرے میں لوگوں کے دل پتھر کے ہونے کے بجائے موم ہونے چاہئیں۔عامر کہتے ہیں کہ لوگ تو اپنے جیسے لوگوں سے وفا نہیں کرتے ایک دوسرے کی جان کے درپے نظر آتے ہیں۔

اتنے مظلوموں کا خوں روز یہاں ہوتا ہے
اب تو شہروں پہ ابھی مقتل کا گماں ہوتا ہے(۱۲۸)

جب انسان پہ انسان مر رہا ہو اور اس ظلم کو روکنے والا کوئی نہ ہو تو ایک شاعر عامر بن علی کی صورت میں اس شہر کو معاشرہ نہیں بلکہ مقتل کا نام دیتا ہے۔یہاں لوگ قتل تو کیے جاتے ہیں مگر ان کو قتل ہونے سے بچانے والا کوئی نہیں ہوتا۔گویا عامر بھی اس مقتل کی منظر کشی کرتے ہیں:

سبھی گم ہو گئے ہیں اپنے اندر
زمانہ کب سے ایسا ہو گیا ہے(۱۲۹)

---

نفرتوں کی کھیتیاں ہیں چار سو
پیار کا موسم بھی آنا چاہیے(۱۳۰)

اس ظلم وستم والے معاشرے میں جہاں لوگ ظالم اور قاتل ہیں وہیں عامر کو ایک اچھے اور مہذب معاشرے کی امید

بھی جھلکتی ہے۔ وہ ایک اچھے معاشرے کا راگ الاپتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ نفرتوں کی کھیتیاں ایک دن ختم ہو جائیں گی اور لوگ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں گے یہ معاشرہ جو ظلم وستم کا معاشرے ہے یہ ایک دن ختم ہو جائے گا۔

## تصورِ وطن

جذبۂ قومیت ہر قوم کا خاصہ ہوتا ہے، مگر حب وطن کچھ قومیں اپنے ہاں رکھتی ہیں۔ عامر بن علی بھی اس قوم کے ایک حصہ میں سے ہیں جو وطن کے ساتھ محبت رکھتے ہیں مگر عامر بن علی وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ وطن کی اقسام بھی اپنے ہاں بیاں کرتے ہیں۔ جو ان کے ہاں ایک منفرد نظریہ ہے۔

بھٹک رہے ہیں اندھیروں میں ہم وطن کب سے
کسی سحر کا ابھی انتظار کرتے ہیں(۱۳۱)

عامر بن علی اپنے وطن کو اندھیروں میں ڈوبا دیکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ایک دن ان کے وطن سے ظلم وزیادتی کا سورج غروب ہو جائے گا اور ہر طرف ایک نئی صبح نمودار ہوگی۔ جو آسانیوں والی صبح ہے۔

نگر والے اگر ہم کو جگہ کوئی نہیں دیں گے
تو پھر جنگل میں بسنے کا چلو اقرار کرتے ہیں(۱۳۲)

لوگ معاشرے میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کو جب بہت زیادہ تنگ کرتے ہیں تو انسان معاشرے سے الگ ہونے کی بات کرتا ہے۔ عامر بھی اسی قسم کا خیال پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بیرونِ ملک جانا کسی جنگل جانے سے کم نہیں ہے۔ وہ اسی لیے اپنے وطن کو ترجیح دیتے ہیں اور وطن کی بات کرتے ہیں:

میرے دیس کی حالت کیوں نہیں بدل جاتی
روز خون ہوتا ہے بے حساب خوابوں کا(۱۳۳)

ایک وطن میں خون کی ہولی اس وطن کو بے سروسامانی تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا عامر بھی اپنے وطن کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اندھیرے کھاتے جاتے ہیں نگر کو
دیا کو جلانا چاہتا ہوں(۱۳۴)

جب عامر کا ملک ایک اندھیرے میں ڈوبا ہے اور لوگ ظلم وستم کا شکار ہوتے جا رہے ہیں تو عامر اس موقع پر ایک اُمید لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ صدا یہ وقت ایسا نہیں رہنے والا۔ ملک میں اندھیروں کو ختم کرنے کے لیے جلد ایک دیا روشن ہو جائے گا اور وہ دیا عامر روشن کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وطن کی محبت میں وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ اس لیے وہ اپنے وطن کو جلتا نہیں دیکھنا چاہتے۔ یہی حب وطن ہے جو ہمیں عامر کے ہاں بخوبی نظر آتی ہے۔

## تصورِ ہجر و وصال

ہماری اردو شاعری میں گل و لالہ اور عشق و عاشقی کے قصوں کے علاوہ ہجر و وصال کی داستاں بھی عام نکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ محبوب سے ملنے کی خوشی ہے تو کہیں اس کی جدائی کا اثر ہے۔ گویا کہ ایک شاعر بھی ان قصوں کو اسی پیرائے میں بیان کرتا ہے جن کو وہ معاشرے میں اپنے مشاہدہ میں لاتا ہے۔ وہ ایک عاشق کی تمنائیں بھی دیکھتا ہے۔ ادیب رضوی کے مطابق:

> ''معشوق عاشق کی سب تمنائیں پوری کر ہی نہیں سکتا، کبھی حیا دامن پکڑتی ہے کبھی فرصت کی کمی راستہ روکتی ہے۔ کبھی امکان کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح نہ معلوم کتنی وجہیں ہیں کہ سد اراہ ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق کی بعض آرزوئیں آسانی سے پوری کی جا سکتی ہیں مگر ایک نفسیاتی کیفیت معشوق کو ان کو پورا کرنے سے روکتی ہے۔''(۱۳۵)

عاشق کو محبوب کا غم ہر وقت رہتا ہے وہ کسی بھی حال میں کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا محبوب اسے اتنی قدر و اہمیت نہیں دیتا، اگر دیتا ہے تو اس کی بھی کچھ اپنی مجبوریاں ہیں۔

ہم فراق یار میں بے حال ہیں
مشکوں سے جی تو گھبراتا نہیں(۱۳۶)

ایک عاشق کو اپنے محبوب کے فراق کے غم سے بڑا غم اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اپنے معشوق کے لیے تڑپتا ہے۔ وہ چاہے عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی۔

ہجر ہے امتحان ہمت کا
وصل تو حوصلوں کا کام نہیں(۱۳۷)

---

چند گھڑیاں نشاطِ وصل کی تھیں

زیست کی زہر ہجر پینے میں(۱۳۸)

یہ ایک عام اور سادہ سی بات ہے کہ ایک عاشق کے لیے ہجر کی گھڑی ایک امتحان سے کم نہیں ہوتی۔اس کو اگر کسی ایک وقت میں خوشی نصیب بھی ہوئی ہے تو وہ محض وقتی ہے۔

قسم جو تو نے دی تھی توڑ ڈالی

انہی راہوں پہ واپس آ گیا ہوں(۱۳۹)

عاشق ہر گھڑی اپنے معشوق کی طرف بھاگتا ہے۔اور اسی کی راہوں میں چلتا ہے۔عامر بن علی بھی اس قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اور محبوب کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی تیری گل میں آجاتا ہوں۔یہی اُن کے جاں ہجر و وصال کی ایک داستان ہے جس کی مماثلت اردو شاعری سے کی جاسکتی ہے۔

# عامر بن علی کی غزل کا فنی جائزہ

عامر بن علی کی شاعری میں جہاں فکری اعتبار سے بلند تخیل اور خیال رکھتی ہے وہیں پر فنی اعتبار سے بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ذیل میں ہم ان کی شاعری کا فنی جائزہ لیں گے:

## استعارہ

منصف خان سحاب، استعارہ کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینا اور اصلاح میں جب کوئی اپنے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور حقیقی اور مجازی میں تشبیہ کا تعلق موجود ہو تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔''(۱۴۰)

پروفیسر انور جمال کے مطابق:

''کسی شے کے لوازمات اور خصوصیات کو کسی دوسری شے سے منسوب کرنا، استعارہ ہے۔ لفظ کو مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کرنا کہ حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔''(۱۴۱)

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں حفیظ صدیقی کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''استعارہ کے لغوی معنی کسی سے کوئی چیز عاریتاً طلب کرنے کے ہیں۔ علم بیان کی اصطلاح میں استعارہ سے مراد وہ لفظ ہے جو مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔ جب کہ بہادر آدمی، سنم کہہ کر محبوب اور چاند کہہ کر بیٹا مراد لیا جائے تو یہ استعارہ ہے شاہ حسین ہنیری کوٹھڑی کہہ کر قبر، کالا ہرن کہہ کر نفس امارہ اور چرغہ کہہ کر جسم انسانی مراد لیتے ہیں۔ یہ سب استعارے ہیں۔''(۱۴۲)

صاحب مخزن بلاغت کچھ یوں استعارے کی تعریف کرتے ہیں:

''لفظ کو ایسے مجازی معنے کے لیے استعمال کرنا جو لفظ کے حقیقی معنے (مصداق حقیقی) سے تشبیہ کا تعلق رکھتے ہوں۔ یعنی معنے حقیقی اور معنے مجازی یا ہم مشبہ بہ اور شبہ کی حیثیت رکھتے ہوں لیکن کلام میں تشبیہ نہ دی گئی ہو، استعارہ کہلاتا ہے۔''(۱۴۳)

عامر بن علی کی شاعری صنعت استعارہ سے مزین ہے۔ آپ نے استعارات کا استعمال بڑے فن کے ساتھ کیا ہے۔ چند شعری مثالیں پیش ہیں، ملاحظہ کیجیے:

تمہاری آنکھ میں دیکھی ہے موتیوں کی لڑی
تمہارے چہرے کو بکھرا گلاب دیکھا ہے(۱۴۴)

اس شعر میں شاعر نے آنکھ سے نکلنے والے آنسوؤں کو موتیوں کی لڑی قرار دیا ہے اور چہرے کو بکھرا گلاب قرار دیا ہے۔ اس میں موتیوں کی خوبصورتی اور چمک دمک مستعار لی گئی ہے اور دوسرے مصرعے میں گلاب کے پھول کی نزاکت اور تازگی کو محسوس کو محبوب کے چہرے کے لیے مستعار لیا گیا ہے۔ شاعر اپنے تخیلانہ انداز میں اپنے محبوب کے رخسار کو گلاب کے پھول سے مستعار لیا۔ اُردو شاعری میں یہ روایت رہی کہ محبوب کی تعریف کے لیے وہ تشبیہ و استعارات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ایسی ہی خوبصورتی سے بھرا اک اور شعر ملاحظہ کرتے ہیں:

خوابوں کی پوجا کرتا ہے
یادوں کا پروانہ شاعر(۱۴۵)

اس شعر میں شاعر نے خود کے لیے شمع پہ جلنے والے پروانوں کا استعارہ استعمال کیا ہے کیونکہ وہاں شمع پر جلنے والے پروانے کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ شمع پر قربان ہوتا جائے وہ اپنے انجام سے بے خبر بس اپنا کام یعنی قربان ہو ہی جاتا ہے۔ شاعر بھی خود خوابوں کی پوجا کرنے والا بتانے کے بعد خود کو محبوب کی یاد کی شمع کا پروانہ قرار دیتے ہیں جو کہ انھوں نے مستعار لیا۔

## تلمیح

تلمیح کے حوالے سے ادبی اصطلاحات میں پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''کلام میں کوئی ایسا لفظ یا مرکب استعمال کرنا جو کسی تاریخی، مذہبی یا معاشرتی واقعے کی

طرف اشارہ کرے، تلمیح کہلاتا ہے۔''(۱۴۶)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصطلاحات میں تحریر کرتے ہیں:

''زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کو بنانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا اور لمبے لمبے قصوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص لفظوں کے ذریعے اشارے ہونے لگے۔۔۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصے وہ واقعے آنکھوں کے سامنے بھر گئے اور ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔''(۱۴۷)

قمر نقوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''کلام میں کسی واقعے، شخصیت یا قصے وغیرہ کی طرف اس طرح اشارہ کرنا کہ قاری کے ذہن میں سارے واقعے یا شخصیت یا قصے کا نقشہ قریب ہو جائے۔''(۱۴۸)

عامر بن علی کی شاعری میں تلمیحات کی رنگینیوں سے بھرپور ملتے ہیں۔ چند اشعار بطور مثال ہیں:

ہیر تنہا ہے جھنگ بیلے میں
رانجھا روگی بنا ادھر جوگی(۱۴۹)

اس شعر میں شاعر عامر بن علی نے ہمارے ادب کی ایک رومانوی داستان کو موضوع سخن بنایا اور اپنے شعر میں بطور تلمیح استعمال کیا۔ ہیر اور رانجھا کا واقعہ ایک حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں بھی عشق کی تروتازگی، پاکیزگی اور لگن نظر آتی ہے۔ دونوں یعنی ہیر اور رانجھا الگ الگ اپنی اپنی راہ ہر عشق کی منزل کی طرف گامزن تھے اور اُس کی تکمیل کے لیے اپنی اپنی جان تک نذرانے میں پیش کر دی۔ شاعر نے دو الفاظ کا استعمال کر کے قاری کے ذہن میں یہ واقعہ نورِ یاد کروا دیا ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

آنکھ دجلہ بنی بدن شعلہ
کس نے پوچھا تیرا گھر جوگی(۱۵۰)

اس شعر میں شاعر نے سسی پنوں اور ہیر رانجھے کے داستان عشق کے قصے شعر میں الفاظ کے اشارات سے یاد کروا

دیے۔ پہلے مصرعہ میں دجلہ دریا کا استعارہ بھی استعمال کیا یعنی دریا میں تیرنے کا تو اس سے سسی کا وہ واقعہ یاد آتا ہے کہ وہ پنوں کے لیے کچے گھڑے پر سوار ہو کر دریا پار کرنے لگتی ہے مگر پھر وہ کچا گھڑا درمیان میں آ کر دھوکہ دیتا ہے اور یوں سسی دریا کی نذر ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے مصرع میں رانجھا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جس میں جوگی کا لفظ استعمال ہوا اور تاریخ میں یہ بات ظاہر ہے کہ رانجھا نے ہیر کی خاطر جوگی کا بھیس بدلا، رانجھے نے عشق میں تمام تر چیزیں بھلا دی ہیں۔

ایک اور شعر دیکھیے جس میں عامر بن علی نے صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے:

نئے نام لے کر زمیں پہ یہ آئیں
کبھی مجنوں لیلیٰ کبھی رادھا رانی(۱۵۱)

اس شعر میں شاعر نے لیلیٰ اور مجنوں اور ہندی تہذیب و ثقافت کی رومانوی داستان رادھا رانی کی کہانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیلیٰ جو مجنوں کے عشق میں گرفتار تھی اور اُس کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کا دعویٰ رکھتی تھی اور اس کی طرح رادھا رانی بھی اپنے محبوب کی خاطر عشق کی ہر سختی جھیلی مگر عشق پر صادر رہی۔ عشق ایک ایسی آگ ہے جس میں انسان روز مرتا ہے اور جیتا بھی روز ہے۔ عشق مر مر کر جینے اور جی جی کر مرنے کا نام ہے۔ عشق خدا کی ایک نعمت ہے اور ہر ایک پر عشق نازل نہیں ہوتا۔ یہ بندے چن لیے جاتے ہیں کیونکہ عشق کی راہیں پُر خطر ہوتی ہیں اور ان راہوں پر چلنا ہر عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور اس پر چلنے کے لیے انسان کو اپنی تمام تر خواہشات، جذبات و احساسات اپنے محبوب کے تابع کرنے پڑتے ہیں اور یہ زندگی کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔

## تشبیہ

کسی بھی ادب پارے میں کسی شے کا ذکر اور پھر مشترک خصوصیات کی بنا پر دوسری شے جیسا قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے۔ منصف خان سحاب لکھتے ہیں:

> ''تشبیہ کے لفظی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینے کے ہیں۔ علم بیان کی رُو سے جب ایک چیز کو کسی مشترک خصوصیات کی بنا پر دوسری چیز کی مانند قرار دیا جائے جبکہ وہ دوسری چیز میں زیادہ پائی جائے تو اُسے تشبیہ کہتے ہیں۔''(۱۵۲)

مولانا سعید الدین کے مطابق:

''بسا اوقات کسی چیز کے متعلق اپنے مدعا اور ماضی الضمیر کو پورے طور پر ادا کرنے کے لیے کلام میں ایک چیز کو کسی دوسری چیز جیسا قرار دیا جاتا ہے اظہار مدعا کے اس طریقے کو تشبیہ کہتے ہیں۔''(۱۵۳)

پروفیسر انور جمال ادبی اصطلاحات میں تشبیہ کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

''تشبیہ انسانی کلام کی ایسی خصوصیات ہے جو کائنات کے مشابہتی رشتوں کو تلاش کرتی ہے۔اس کا مدعا دنیا کے تفرقوں میں وسیع تر ہم آہنگی کا اثرات ہے۔تشبیہ میں ایک چیز کو ایک یا ایک سے زیادہ مشترک خصوصیات کی بناء پر دوسری کی مانند قرار دیا جاتا ہے اور اس طرح پہلی چیز کی اہمیت یا شدت کو واضح کیا جاتا ہے۔''(۱۵۴)

سید عابد علی عابد تشبیہ کی تعریف ''البیان'' میں کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''تشبیہ وہ فن ہے جس کے ذریعے فنکار، انشا پرداز یا خطیب مختلف چیزوں میں مشابہتیں دریافت کرتا ہے۔''(۱۵۵)

عامر بن علی کی غزلوں میں جہاں دیگر صنعتیں بھرپور انداز میں مستعمل ہیں وہیں صنعت تشبیہ بھی مستعمل ہے۔اس کی مثال ملاحظہ کریں:

ہے لہجہ تیرا جیسے بجتی ہو پائل
ہیں باتیں تری جیسے کوئی کہانی(۱۵۶)

اس شعر میں عامر بن علی نے محبوب کے لہجے کو پائل سے تشبیہ دی ہے اور دوسرے مصرعے میں محبوب کی باتوں کو میٹھی سریلی کہانیوں سے تشبیہ دی ہے۔اُردو شاعری میں یہ روایت رہی ہے کہ وہ محبوب کی خوبصورتی کو محبوب کی تعریفات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔عامر بن علی نے بھی محبوب کی تعریفات کو تخیلاتی انداز میں بیان کیا ہے اور بڑھا چڑھا کے بیان کیا ہے۔تعریفات کو مزید اچھا بنانے کے لیے انھوں نے تشبیہ کا سہارا لیا ہے۔

## صنعت تضاد

پروفیسر انور جمال صنعت تضاد کے بارے لکھتے ہیں:

''(شعری صنعت ہے) جب کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں اور مقابلی ہوں۔''(۱۵۷)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کے مطابق:

''علم بدیع کی اصطلاح میں تضاد کے معنی ہیں ایسے الفاظ استعمال میں لانا جن کے معنی ایک دوسرے کی ضد اور مقابل ہوں۔''(۱۵۸)

منصف خان سحاب ''نگارستان'' میں لکھتے ہیں:

''کلام میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ لانا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔''(۱۵۹)

عارف حسن خان صنعت تضاد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''صنعت طباق، اس کو صنعت تضاد اور مطابقت بھی کہتے ہیں یعنی ایسے الفاظ استعمال میں لائیں جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے فی الجملہ ضد اور مقابل ہوں۔''(۱۶۰)

مولانا سعید الدین کوثر اس کے حوالے سے کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''کلام میں دو ایسے معنے لائے جائیں جو ایک دوسرے کے مقابل نوعیت کے ہوں۔''(۱۶۱)

امام بخش صہبائی ''حدائق البلاغت'' میں اس صنعت کے مزید نام بھی بتاتے ہیں اور کچھ یوں تعریف کرتے ہیں:

''اس کو طباق، طبیق، مطابقت اور تکافو بھی کہتے ہیں۔ یہ صنعت اس طرح سے ہے کہ کسی لفظ کے معنی دوسرے لفظ کے مخالف ہوں۔''(۱۶۲)

عامر بن علی کی غزلوں میں اب صنعت تضاد کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ہیں اٹل اصول زمین کے
کہ عروج کو ہی زوال ہے(۱۶۳)

اس شعر میں عامر بن علی نے صنعت تضاد کا استعمال کیا ہے۔ دوسرے مصرع میں عروج کا متضاد زوال بھی استعمال

ہوا۔اس شعر میں ''عروج'' اور ''زوال'' کا استعمال ہے۔ یہ دونوں الفاظ آپس میں متضاد ہیں۔اس طرح ان کی غزلوں میں ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

دشت وصحرا یا جنگل نہیں کوئی یہ جونگر کو چلیں
شہر کی بھیڑ میں ہوں اکیلا کھڑا جی بہلتا نہیں (۱۶۴)

اس شعر میں عامر بن علی نے صنعت تضاد کا استعمال کیا ہے۔اس شعر کے ردوسرے مصرع میں ''شہر کی بھیڑ'' اور ''اکیلا'' کا استعمال کیا ہے۔بھیڑ اور تنہائی یہ دونوں متضاد ہیں۔

## استفہامیہ انداز

اس سے مراد ہے کہ کلام میں سوال کی صورت شعر کہا جائے۔مثال کے طور پر مرزا غالب کے دیوان کا پہلا شعر ہی اپنے اندر ایسا خلا رکھتا ہے جو شاید آج بھی پورا نہیں کیا جا سکا۔وہ شعر آج بھی ذات وکائنات کے بارے بہت سے سوالات اُٹھاتا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا (۱۶۵)

شاعری کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شاعری صرف قاری کو لطف اندوز، محظوظ کرنے اور اس کے لیے مسرت کا باعث بنتی ہے لیکن یہ باتیں محض ابتدائی سطح پر درست ثابت ہوتی ہیں، مگر جب شاعری کو اعلیٰ فکری وفنی مدارج کی انتہا پر پہلے پرکھا جاتا اور سمجھا جاتا ہے تو شاعری ذات کا ایسا خلا ہے جو شاعر کے اندر موجود ہوتا ہے اور شاعر اس خلا کو فنکارانہ مہارت سے قاری کے سامنے کچھ اس انداز سے رکھتا ہے کہ بعض اوقات اس خلا کو بھرنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔مثال کے طور پر دیوانِ غالب کا پہلا ہی شعر اپنے اندر ایسا خلا رکھتا ہے جس خلا کو آج تک بھرا نہیں جا سکا اور وہ شعر آج بھی ذات وکائنات کے بارے مجموعہ سولات ہے۔

عامر بن علی کی شاعری بھی اس جہاں پر بہت سے سوالات اُٹھاتی ہے۔سوالیہ انداز سے بھرپور کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

پیاس اور خون کی موجوں پہ بھی شاکر ہے
صحرا میں یہ کوئی گھرانہ آیا ہے (۱۶۶)

اس شعر میں استفہامیہ انداز بھی ہے اور تلمیح بھی ہے۔ استفہامیہ انداز اس کے دوسرے مصرع میں ہے کہ صحرا میں آنے والے گھرانے کا پوچھا جا رہا ہے کہ یہ گھرانہ کون ہے؟ جو پیاس اور خون کی موجوں پہ بھی خدا کی مرضی میں راضی ہے۔ اُس مالک کی خوشی میں خوش ہے۔ وہ گھرانہ آلِ رسول ﷺ کا ہے۔ وہ گھرانہ علی المرتضیٰ شیر خداؓ کا گھرانہ ہے۔ اس گھرانے نے پیاس اور خون کی موجوں پہ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا میں اپنی رضا سمجھی اُس کی مرضی میں خوش ہوئے اُس کی مرضی کے آگے کچھ نہ کیا جو ہوا خدا کا حکم سمجھ کر صبر و استقامت سے برداشت کیا۔ ۶ سالہ بچے سے لے کر ۸۰ سال کے بزرگ کو شہادتوں کا ایک سلسلہ ہے جو حقیقت میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ وہ گھرانہ ہے جس نے اسلام کو ایک نئے سرے سے زندہ کیا۔ سوالات سے بھرپور ایک شعر بطور مثال ہے:

کیسا غم ہے جو ہر اک روز بڑھا جاتا ہے؟
وقت کے ساتھ سنا تھا کہ سنبھل جاتے ہیں(۱۶۷)

عامر بن علی کے کلام میں پوری غزل صنعت استفہامیہ سے مزین بھی نظر آتی ہے اُسی غزل کے چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

محبتوں کے حسین سفر میں اذیتوں کا یہ باب کیسا
یقیں اپنا ہے تیری چاہت گناہ کیا ہے ثواب کیسا

کہ وہ جو حرفوں کی وسعتوں سے کہیں پرے ہیں بہت بڑے ہیں
جو زخم دل پر لگے ہیں ان پر سوال کیا ہو ، جواب کیسا؟

سنبھل نہ ، سمجھ نہ پاؤں کہ شاید اب کے میں ہی مر جاؤں
جدائیوں کے کٹھن سفر کا میں کیا کہوں ہے نصاب کیسا؟(۱۶۸)

اسی طرح ایک اور غزل جس کی ردیف ہی ''کیوں'' ہے جو صنعت استفہامیہ سے مزین نظر آتی ہے۔ چند اشعار بطور مثال پیش خدمت ہے:

مجھے بتا تو سہی تو کہ سوگوار ہے کیوں؟
جو ہنستا رہتا تھا چہرہ وہ اشکبار ہے کیوں؟

تجھے جو غم ہے تو مجھ کو بھی کچھ بتا ہمدم
نہیں ہے زخم کوئی بھی تو بے قرار ہے کیوں؟

چلو یہ مان لیا بات بات کچھ نہیں لیکن
تمہارے مکھڑے پہ اشکوں کی آبشار ہے کیوں؟

نہیں اگر کوئی بچھڑا تو پھر بتا عامرؔ
غبار ہجر ترے رُخ پہ آشکار ہے کیوں؟(۱۶۹)

عامر بن علی کی شاعری پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اس کائنات سے سوالات لائے جاتے ہیں اور سوال کرنا علم کے دروازے پر دستک دینے کے مترادف ہے۔ان کی ایک غزل کا ایک مطلع ملاحظہ کیجیے جس میں بڑے خوبصورت انداز میں وہ محبت کے بارے میں سوالات اُٹھا رہے ہیں:

یہ کیا ہے محبت ، یہ کیا ہے جوانی
عجب داستاں ہے ، انوکھی کہانی(۱۷۰)

اس شعر میں انھوں نے جوانی اور محبت کے بارے سوالات اُٹھائے ہیں۔محبت جو کہ ایک فطری عمل ہے اور اس پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا اور انسان اس کے آگے بے بس ہوتا ہے۔

## صنعت سہل ممتنع

ادبی اصطلاحات میں پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''(شعری اظہار کی اصطلاح ہے) ایسا شعر جو اس قدر آسان لفظوں میں ادا ہو جائے

کہ اس کے آگے مزید سلاست کی گنجائش نہ ہو ''سہلِ ممتنع'' کہلاتا ہے۔''(۱۷۱)

ڈاکٹر مزمل حسین صنعتِ سہل ممتنع کے بارے رقمطراز ہیں:

''سہل کے لغوی معنی آسان کے ہیں جبکہ ممتنع کا مطلب دشوار یا مشکل ہے۔ اصطلاح میں ایسا شعر جو بظاہر آسان ہو مگر درحقیقت ایسا کلام کہنا دشوار ہو یا اتنا آسان اور سادہ شعر جس کی نثر نہ کی جا سکے۔''(۱۷۲)

حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات میں لکھتے ہیں:

''لغت میں سہل آسان کے معنی میں ہے اور ممتنع دشوار کے معنی میں۔ اصطلاح میں ایسے شعر کو کہتے ہیں جس کی مثال بنانا دشوار ہوا اگرچہ بظاہر سہل معلوم ہوتا ہو۔''(۱۷۳)

عامر بن علی نے قافیہ و ردیف، تشبیہات و استعارات کے جوہر دکھلائے ہیں۔ وہیں پر انھوں نے عام فہم اور سہل اشعار بھی لکھے ہیں ایسے ہی سہل ممتنع سے مزین ایک شعر بطور مثال پیش ہے:

پھر کسی با وفا نے ٹھکرایا
پھر اسی بے وفا کی یاد آئی(۱۷۴)

یہ ایسا شعر ہے جس کو عام آدمی بھی پڑھ کر اس کے معنی و مفہوم سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس کی مزید تشریح یا وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اسی طرح ایک اور غزل کے دو اشعار بطور مثال پیش ہیں:

مرا درد میرا سوال ہے
ترا بھولنا بھی کمال ہے

ترے بعد ایسی ہے زندگی
نہ خوشی نہ کوئی ملال ہے(۱۷۵)

عامر بن علی کے اشعار عام فہم اور فلسفیانہ موشگافیوں سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ عام فہم اور فطری شاعری کرتے ہیں جو کہ ہر ایک کی سمجھ اور شعور میں سما سکتی ہے۔

## تخلص

پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''شاعر اپنے ذاتی اور خاندانی نام کے علاوہ جو نام شاعرانہ شناخت کے طور پر اپناتا ہے اسے اصطلاحاً تخلص کہتے ہیں۔''(۱۷۶)

نگارستان میں منصف خان سحاب کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''وہ مختصر نام جو شاعر اس غرض سے اختیار کر لیتے ہیں اسے اشعار میں استعمال کیا جا سکے۔''(۱۷۷)

حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصطلاحات میں لکھتے ہیں:

''تخلص وہ مختصر نام ہے جسے شعرا اس غرض سے اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے اشعار میں استعمال کیا جائے۔ مولانا اصغر علی روحی صاحب دبیر عجمہ کے اس بیان پر محققین کا اتفاق ہے کہ ''تخلص'' شعرائے ایران کی اختراع ہے۔ اہلِ عرب اس سے آشنا نہ تھے۔ عرب شعرا تخلص کی بجائے اپنے لقب یا کنیت سے شہرت پاتے تھے۔''(۱۷۸)

عامر بن علی نے جہاں مختلف ادبی شعری اصطلاحات کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ وہیں انھوں نے صنعت تخلص سے شاعری کو چار چاند لگائے ہیں۔ تخلص کے چند اشعار بطور مثال پیش خدمت ہیں:

عاشقی کا ہے حق یہی عامرؔ
عشق جائے جو جائے سر جوگی(۱۷۹)

اس شعر میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ تخلص جس شعر میں استعمال ہو وہ مقطع کہلاتا ہے۔ اور مقطع غزل کا آخری شعر ہوتا ہے۔

جن کو منزل سے شناسا کیا ہم نے عامرؔ
وہ ہمیں دیکھ کے رستہ ہی بدل جاتے ہیں(۱۸۰)

اس شعر میں بھی شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے:

جو کہتا ہے سچ کہتا ہے
اس کو کہے زمانہ شاطر(۱۸۱)

## صنعت سیاقۃ الاعداد

عارف حسن خان لکھتے ہیں:

''یعنی کلام میں ذکر کرنا عددوں کا خواہ ایک سے دس اور اس سے زیادہ تک خواہ برعکس اس کے ایک اور عدد خواہ ترتیب وار ہوں یا بے ترتیب۔''(۱۸۲)

صاحب نگارستان لکھتے ہیں:

''کلام میں اعداد کا ذکر کرنا چاہے وہ ترتیب سے ہوں یا بغیر ترتیب کے۔''(۱۸۳)

مولانا سعید الدین مخزن بلاغت میں لکھتے ہیں:

''کلام میں کچھ اعداد کا مناسب پیرائے اور تسلسل سے ذکر کرنا۔''(۱۸۴)

عامر بن علی نے اپنی غزلوں میں صنعت سیاقۃ الاعداد کا استعمال بڑی خوبصورتی اور احسن انداز میں کیا ہے۔ چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

دھواں دھواں ہے یہ دل کی بستی چہارسو لپکتے شعلے
بس ایک ننھی سی میری خواہش پہ میرے مولا عذاب کیسا(۱۸۵)

اس شعر میں شاعر نے لفظ ''چہارسو'' کا استعمال کیا ہے جو چار کے معنوں میں آتا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر دیکھیے:

نہ رہ سکوں گا میں زندہ بچھڑ کے تجھ سے کبھی
کیسے ہزار کوئی جی کے میں بتا دوں گا(۱۸۶)

اس شعر میں ''ہزار'' کا لفظ سیاقۃ الاعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ علم ریاضی میں سینکڑہ یعنی ہزار افراد ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے:

ڈھونڈے علاج جو کوئی درد و فراق کا
ایسا کوئی طبیب مرے چار سو نہیں(۱۸۷)

اس شعر میں بھی شاعر نے ''چہار'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ شعر کا مفہوم کچھ یوں اپنے معنی ظاہر کرتا ہے کہ درد و فراق کا

علاج جوڈھونڈ لیں ایسا کوئی طبیب میرے چار اطراف میں نہیں ہے۔لفظ ''چہار'' چار کے معنوں میں آیا ہے۔

## صنعت مراعات النظیر

پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''علم بدیع کی اصطلاح ہے۔مراعات النظیر کو توفیق، تلفیق اور ایتلاف بھی کہتے ہیں۔ ''مراعات النظیر'' اس صنعت کاری کا نام ہے جس کے ذریعے کلام میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن کے معنوں میں ایک خاص مناسبت اور تعلق ہو، لیکن یہ مناسبت و تعلق، تقابل و تضاد کے نہ ہو۔''(۱۸۸)

مولانا سعید الدین مخزنِ بلاغت میں لکھتے ہیں:

''کلام میں چند ایسے معنے جمع کیے جائیں جن میں تضاد نہ ہو بلکہ بہم کسی قسم مناسبت ہو اور وہ ایک ہی سلسلے کی چیزیں ہوں۔''(۱۸۹)

منصف خان سحاب لکھتے ہیں:

''مراعات کے معنی ملحوظ رکھنا اور نظیر کے معنی مثال کے ہیں۔اس میں مماثلت کی نسبت ہوتی ہے۔تضاد کی نہیں ہوتی اسے صنعت تناسب بھی کہتے ہیں۔''(۱۹۰)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی مراعات النظیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس کو تناسب، توفیق، ایتلاف اور تلفیق بھی کہتے ہیں۔شعر یا جملے میں ایسے الفاظ جمع کرنا جو ایک دوسرے کے ساتھ سوائے نسبت تضاد کے کوئی اور مناسبت رکھتے ہوں علم بدیع کی اصطلاح میں مراعات النظیر کہلاتا ہے۔''(۱۹۱)

عارف حسن خان لکھتے ہیں:

''اس کو تناسب اور توفیق اور ائتلاف تلفیق بھی کہتے ہیں یعنی ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سوائے نسبت تضاد کے کچھ مناسبت رکھتے ہوں، جیسے چمن کے ذکر کے ساتھ گل و بلبل و باغبان و سرو و قمری وغیرہ کا ذکر

کرنا۔''(۱۹۲)

صنعت مراعاۃ النظیر سے لبریز عامر بن علی کی غزلوں کے چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

چھان کر صحرا جو دیکھا تب کہیں مجھ پر کھلا
ریت میں کھوئی ہوئی شے قیمتی نہیں ملتی(۱۹۳)

اس شعر میں صحرا کی نسبت ریت چھاننا اور پھر کسی چیز کا کھونا اور وہ چیز بھی قیمتی ہو یہ صفت مراعات النظیر ہے۔ کسی ایک کی نسبت سے کسی دوسری چیز کا ذکر جہاں استعمال ہو وہاں شعر میں ایک خوبصورت احساس اور تروتازگی پیدا ہوتی ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کرے:

زرد پتے گرتے رہے ہیں جو خزاں کے خوف سے
پیڑ سے جو کٹ گرے تو زندگی ملتی نہیں(۱۹۴)

اس شعر میں بھی زرد پتوں کی نسبت سے خزاں کے خوف کا ذکر اور پیڑ کا ذکر یہ سب مراعات النظیر میں شامل ہیں۔ ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

طویل غم ، شب تنہائی اور تاریکی
کتاب زیست کا جو اشاب دیکھا ہے(۱۹۵)

اس شعر میں تاریکی اور شب تنہائی اور طویل غم کا ذکر ایک دوسرے کی نسبت سے ہے جو مراعات النظیر ہے اس سے شعر میں مزید نکھار آیا ہے اور اس شعر میں ترکیب کا استعمال بڑھی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

## صنعت تکرارِ حرفی

شعر میں کسی حرف کا ایک سے زیادہ یعنی بار بار آنا تکرار حرفی کہلاتا ہے۔ تکرار حرفی سے بھرپور عامر بن علی کی غزلوں کے چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

شب فراق میں پُر درد خواب دیکھا ہے
کہ اپنے پیار کا دریا سراب دیکھا ہے(۱۹۶)

اس شعر میں حرف ''ر'' کی تکرار ہو رہی۔ یہ تکرار چھے بار ہو رہی ہے۔ جب شعر میں تکرار ہوتی ہے تو اس سے شعر میں

ایک ردھم اور سرور پیدا ہوتا ہے اور یہ شاعرانہ پختگی کے ممکن نہیں۔ یہ شعر شاعر کی فنی پختگی کے حوالے سے بھی اہم شعر ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

اُلجھنوں سے نجات کیسے ہو
دل دل تک کی بات کیسے ہو(۱۹۷)

اس شعر میں حرف ''س'' کی تکرار چار بار، حرف ''ل'' کی تکرار تین بار، حرف ''ا'' کی تکرار تین بار، حرف ''ے'' کی تکرار چار بار اور حروف ''د''، ''ہ'' اور ''و'' کی تکرار دو، دو بار آئی ہے جس سے شعر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے:

لوگ تو دیوانہ کہہ کر سنگسار کریں
سارے شہر کے سر تم کیسے پھوڑو گے(۱۹۸)

اس شعر میں بھی شاعر نے اپنی فنی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ اس شعر میں حرف ''س'' کی تکرار پانچ بار ہے اور حرف ''ک'' کی تکرار بھی پانچ بار ہے۔ اور حرف ''ر'' کی تکرار مجھے بار آئی ہے۔ حرف ''و'' کی تکرار چار بار آئی ہے۔ حرف ''گ'' کی تکرار تین بار، حرف ''ے'' کی تکرار تین بار اس شعر میں آئی ہے۔

## صنعتِ تکرار لفظی

کلام میں الفاظ کی تکرار کی صنعت کو صنعتِ تکرار کہتے ہیں۔ ایک لفظ یا کء الفاظ کا بار بار آنا تکرار کہلاتا ہے۔ افتخار شفیع کے مطابق:

''کسی بھی شعر میں الفاظ کی تکرار سے حسن پیدا کرنے کے عمل کو ''تضاد'' کہتے ہیں۔''(۱۹۹)

عامر بن علی نے تکرار حرفی کی طرح تکرار لفظی میں بھی فنی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ اس حوالے سے شعر ملاحظہ کریں:

لمحہ لمحہ گیا زمانہ آیا ہے
برسوں بعد اک بار پرانا آیا ہے(۲۰۰)

اس شعر میں لفظ ''لمحہ لمحہ'' کی تکرار آئی ہے اور اس سے شعر کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ ایک اور شعر مزید ملاحظہ کریں:

نگر نگر کا سفر بس ایسی سبب سے ہے
نجانے کون سی بستی میں تیرا گھر ہو گا(۲۰۱)

اس شعر میں شاعر عامر بن علی نے لفظ ''نگر نگر'' کی تکرار کے ساتھ شعر خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔مزید شعر ملاحظہ کیجیے:

راز رکھتا تھا تیری چاہت کو
تذکرے بار بار کرتا ہوں(۲۰۲)

اس شعر میں لفظ ''بار بار'' کی تکرار موجود ہے۔مزید شعر ملاحظہ کریں:

شہروں شہروں دیس میں خوف کا پہرہ ہے
کہتی ہے سرکار یہ دور سنہرا ہے(۲۰۳)

اس شعر میں لفظ ''شہروں شہروں'' کی تکرار ہے۔ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

میں کرچی کرچی بکھر چلا ہوں
یہ وقت جیسے پگھل رہا ہے(۲۰۴)

اس شعر میں بھی لفظ ''کرچی کرچی'' کی تکرار موجود ہے۔

## خطابیہ انداز

اس سے مراد شاعری میں ایسا پیرایہ اظہار لانا کہ شاعری میں کسی کو مخاطب کرنا،اور اس کے ساتھ ندائیہ یا فجائیہ کی علامت کا استعمال بھی ہوا ہو۔

ناصر بن علی نے جہاں دیگر فنی لوازمات سے شاعری کو نکھارا ہے۔وہیں پر انھوں نے خطابیہ انداز سے شاعری کو رونق بخشی ہے۔ملاحظہ کریں:

اے خوابوں کی ملکہ! خیالوں کی رانی
ہے تجھ بن ادھوری مری زندگانی

یہ لیلیٰ یہ رادھا بھی تجھ سے ہیں شاید
نیا نام ہے پر ہے صورت پرانی (۲۰۵)

اس شعر میں شاعر نے تخیلاتی انداز میں اپنے محبوب کو مخاطب کیا ہے اور اس شعر میں صنعت تلمیح کا بھی استعمال ہے۔

## دعائیہ انداز

اس سے مراد کلام میں ایسے اشعار لانا جس میں دعا کی گئی ہو۔ مثال ملاحظہ ہو:

تنہا پنچھی کا نشیمن لٹ نہ جائے اے خدا
ٹہنی نازک ہے شجر کی بارشیں ہیں زور میں (۲۰۶)

اس شعر میں شاعر نے خدا سے دعا کے انداز میں بات کی ہے کہ نازک ٹہنی ہے اور زور سے بارشوں کا برسنا جاری ہے۔ ایک اکیلا پنچھی جس کا مسکن اسی ٹہنی نازک پر ہے اس کا نشیمن نہ لٹ جائے۔ اس انداز کو ادبی اصطلاح میں دعائیہ انداز کہتے ہیں اور عامر بن علی نے دیگر فنی اصطلاحات کی طرح اس میں بھی اپنی مہارت کے جوہر دکھائے ہیں۔

## صنعت تجسیم

پروفیسر انور جمال ادبی اصطلاحات میں صنعت تجسیم کے بارے رقم طراز ہیں:

''غیر مرئی حقائق، جبلات یا عادات وغیرہ کو حرکی، مادی جسم میں ڈھال کر پیش کرنا تجسیم (Personification) کہلاتا ہے۔ زندگی، موت، نفرت، غصہ، شوق، خوف، خوشی، غم وغیرہ کو جسمانی اور محسوس انسانی افعال و خصوصیات سے متصف کرنا تجسیم ہے۔''(۲۰۷)

اردو ادب میں بہت سے شعرا نے اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ حضرت اقبال کی شاعری اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ آپ کی مشہور نظمیں بھی اس صنعت سے متصف ہیں۔ کلامِ اقبال سے پہلے چند مثالیں پیش ہیں تاکہ صنعت کا صحیح مفہوم واضح ہو سکے:

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے (۲۰۸)

کلامِ اقبال کی صرف ایک مثال دیکھیے جو بالِ جبریل سے نظم ''پرواز'' سے ہے:

کہا درخت نے اک روز مرغ صحرا سے
ستم یہ غم کدہ رنگ و بو کی ہے بنیاد(۲۰۹)

علامہ اقبال نے ان اشعار میں غیر مجسم، غیر انسانی چیزوں کو انسانی صفات سے مزین کر کے ان سے مکالماتی انداز میں بات کروائی ہے۔ اسی طرح اقبال کی دیگر نظمیں، حسن و عشق، عقل و عشق وغیرہ مشہور ہیں۔

اس صنعت کا استعمال عامر بن علی نے اپنی شاعری میں بڑے احسن انداز میں کیا ہے۔ شعر پیش خدمت ہے:

نفسا نفسی چار سو ہے ہر کوئی ہے جنگ میں
تو بتا دیوانے جائیں اب بھلا کس ور میں(۲۱۰)

اس شعر میں غیر مادی چیز کو ایک جسم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صنعت شاعر کے فنی حوالوں سے پختگی کو ظاہر کرتی ہے۔

## چھوٹی بحر

شاعر اپنی شاعری کو بہتر سے بہترین بنانے اور اپنے فنی جمال کا مظاہرہ مختلف صورتوں میں کرتا ہے۔ کبھی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہہ کر تو کبھی بڑی بحور کا استعمال کر کے اور کبھی چھوٹی بحور پر مشتمل اشعار کہتا ہے جس سے اس کے فنی کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ انتہائی کم الفاظ میں یہ بات کہنا اس کی وضاحت و بلاغت کی نشانی ہے۔

اس صنعت کا استعمال اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جہاں شاعر بڑی بڑی بحور کو استعمال میں لاتا ہے وہیں پر وہ اپنے کلام کو مدلل، جامع بنانے کے لیے اس کو مختصر بھی کرتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کو جامعیت میں پیش کرتا ہے۔ یہ بات اُس کے فنی شعور کو قاری کے سامنے لا کے رکھتا ہے۔ چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

وہ تیرا دیوانہ شاعر
دنیا سے بیگانہ شاعر

راتوں کو تنہا سڑکوں پر
پھرتا ہے مستانہ شاعر

خوابوں کی پوجا کرتا ہے
یادوں کا پروانہ شاعر

جو کہتا ہے سچ کہتا ہے
اُس کو کہے زمانہ شاعر(۲۱۱)

ان مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے کس کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے کہ اپنی بات کو کم الفاظ میں جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ صنعت ایک کمال فن کا مظاہرہ کرنے والا شاعر ہی استعمال کرسکتا ہے۔ بات کو بڑھانا تو سب کو آتا ہے مگر بات مزید جامع انداز میں اور مختصر الفاظ میں کہہ دینا جس سے اُس کا مفہوم بھی واضح ہو رہا ہو اور بات بھی پوری ہو جائے۔ یہ سب عامر بن علی کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

## منفرد ردیف

عامر بن علی نے جہاں فکری حوالوں سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے وہی پر فنی اعتبار سے بھی اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے غزلوں میں سنگلاخ زمینوں اور منفرد ردیفوں کے تجربات سے غزل کو ایک نیا پیرہن دیا۔ ان کی غزلوں میں یہ چیز بھی حیرت افزا ہے کہ یہ سنگلاخ زمینوں کا استعمال بھی کرتے ہیں اور اپنی غزل میں عصر حاضر کے مسائل پر اشعار بھی کہتے ہیں۔ اس صنعت کا استعمال کرنے کے بعد ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر عام روایتی ردیف استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے کلام میں انفرادیت کا متقاضی ہے۔ وہ ردیف میں منفرد انداز لاتا ہے جس سے کلام میں نئی تازگی ملتی ہے۔ اس حوالے سے عامر بن علی کے کلام سے غزلوں کے چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

تن پر آفت پڑی ہے ساجن
من میں آگ بڑھی ہے ساجن

لیٹا ہوں شعلوں کے کفن میں

مشکل بہت گھڑی ہے ساجن

دشت دید میں ننگے پاؤں
سر پر دھوپ کڑی ہے ساجن

آنکھوں میں ماضی کے منظر
اور اشکوں کی لڑی ہے ساجن(۲۱۲)

اس غزل کی ردیف ''ساجن'' ایک منفرد انداز میں سامنے آئی۔اسی طرح ایک اور منفرد ردیف کی حامل غزل ملاحظہ ہو:

عشق اپنا اصول ہے پیارے
باقی سب کچھ فضول ہے پیارے

کیا بتائیں تباہیوں کا سبب
ہم کو سب کچھ قبول ہے پیارے

سب کی آنکھوں میں یہ نمی کیسی؟
دل تو اپنا ملول ہے پیارے

تاقیامت رہے گا راج ان کا
تخت والوں کی بھول ہے پیارے(۲۱۳)

مندرجہ بالا دونوں مثالوں میں ہر غزل کی ردیف ایک منفرد انداز میں شاعر نے پیش کی ہے اور اس سے ان کا فنی شعور

کھل کر قاری کے سامنے آتا ہے۔ عامر بن علی کی شاعری اور ان کا فنی شعور کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ہر قاری کے ذہن میں ان کا خیال و جذبہ بڑے واضح انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے اور دورِ حاضر کے بڑے بڑے ادیبوں شاعروں نے ان کے فن کو سراہا ہے۔ منو بھائی لکھتے ہیں:

''عامر بن علی اس نوجوان نسل کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہمارے بزرگ، بے کار اور اپنے آپ تک محدود نسل کی توجہ سے یکسر محروم رہی اور جسے ورثے میں جھوٹ، منافقت اور فریب کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ ذہنی افلاس، اخلاقی بانجھ پن، سیاسی خلفشار اور بیمار معیشت میں پلے والے اس نوجوان نسل کی یہ اپنی ہمت اور جرأت ہے کہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتیں اور توانائیاں تلاش کر رہی ہے۔''(۲۱۴)

احمد عقیل روبی سرگوشیاں کے بارے لکھتے ہیں:

''عامر بن علی کی ''سرگوشیاں'' سے یہ چند سرگوشیاں جو میں نے پیش کیں۔ ان سے اندازہ لگانا قطعاً دشوار نہیں کہ اس نوجوان شاعر نے براہِ راست اپنے اندر کے احساس کو کتنے خوبصورت پیرائے میں لفظوں کو زبان دی ہے اور کتنے سادہ و سہل مگر دلکش اور واضح طرزِ اظہار میں اپنی سرگوشیوں کو مکالماتی جرأت بخشتی ہے۔ کتاب پڑھیے اور عامر بن علی کی ''سرگوشیاں'' سنیے۔''(۲۱۵)

عامر بن علی کی غزلوں میں لب و لہجہ نئی عمر کے پیڑ سے اتری پہلی فصل کی طرح خریدار ہے۔ میٹھا، ترش اور چٹ پتا۔ انہیں پڑھ کر ابھرتی نسل کے ان محبت آشنائی ملتی ہے جو ہماری دنیا کے نئے دور اور عصر حاضر کے ماحول میں بھی زندہ ہے۔

# حوالہ جات


۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، غزل کے رنگ، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو غزل کی شعری روایت، کراچی: حلقہ نیاز و نگار، ۱۹۹۵ء، ص ۲

۳۔ ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۶۳

۴۔ گوپی چند نارنگ، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۲

۵۔ سعد حسن خاں، مولانا و دیگر، مترجمین: المنجد، کراچی: دارالاشاعت، یازدہم ۱۹۹۴ء، ص ۸۰۷

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع پنجم ۲۰۰۶ء، ص ۵۷

۷۔ آل عمران: ۳۱

۸۔ نجم الغنی رام پوری، بحر الفصاحت (جلد اوّل)، مرتب: سید قدرت نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ۱۵۹

۹۔ غالب، مرزا، دیوانِ غالب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۱

۱۰۔ زکریا، ڈاکٹر خواجہ، انتخاب زریں ___ اردو غزل، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۸ء، ص

۱۱۔ محمد افتخار شفیع، اصنافِ شاعری، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۱ء، ص ۳۳

۱۲۔ یوسف حسین خاں، اردو غزل (جلد اوّل)، لاہور: القمر انٹر پرائزز، س ن، ص ۱۰

۱۳۔ انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقاء، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۹۴۷

۱۴۔ محمد افتخار شفیع، اصنافِ شاعری، ایضاً، ص ۲۷

۱۵۔ ظفر اقبال، ٹیلی فونک رابطہ، ۱۰ جنوری ۲۰۱۶ء، شام ۵:۳۵

۱۶۔ ابوالاعجاز حفیظ، صدیقی، (مرتبہ)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۹

۱۷۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۱۸۔ مولوی سید تصدق حسین رضوی، (مرتبہ)، لغاتِ کشوری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۳۱

۱۹۔ درسی اُردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (طبع دوم) ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۵

۲۰۔ ذوالفقار احمد تابش، اعجاز اللغات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۴۰۸

۲۱۔ مولوی نور الحسن، (مرتب)، نور اللغات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، (جلد سوم)، ۱۹۸۹ء، ص ۵۸۵

۲۲۔ شمس قیس رازی، المعجم فی معائر اشعار العجم، تہران: دانش گاہ، س ن، ص ۱۶

۲۳۔ سلام سندیلوی، ادب کا تنقیدی مطالعہ، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، س ن، ص ۳
۲۴۔ عابد علی عابد، سید، اصولِ انتقاد ادبیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء
۲۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان شاعرات: تخلیق خدوخال، مقدمہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۳۷
۲۶۔ فراق مضمون، غزل کیا ہے؟، لاہور: شاہکار شمارہ ۴، ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۰
۲۷۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۲۳۵
۲۸۔ احمد دہلوی، سیّد، مولوی، (مرتبہ) فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم، چہارم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۲
۲۹۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، لاہور: شعبہ اردو، جی۔سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۴
۳۰۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱
۳۱۔ مجنوں گورکھپوری، پروفیسر، شعر اور غزل، مشمولہ: اردو شاعری کا فنی ارتقاء، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۶۴
۳۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، غزل اردو کی شعری روایت، کراچی: حلقہ نیاز و نگار، ۱۹۹۵ء، ص ۲
۳۳۔ ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی ہیئتی اور عروضی سفر، لاہور: مجلسِ ترقی ادب اردو، ۲۰۰۸ء، ص ۶۳
۳۴۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۲ء، ص ۹۸
۳۵۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۱ء، ص ۶۴
۳۶۔ ادیب، مسعود حسن، سید، رضوی، ہماری شاعری، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص ۴۳
۳۷۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲
۳۸۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص ۱۵
۳۹۔ ایضاً، ص ۲۱
۴۰۔ ایضاً، ص ۲۶
۴۱۔ ایضاً، ص ۳۲
۴۲۔ ادیب، مسعود حسن، سید، رضوی، ہماری شاعری، ص ۱۲۵
۴۳۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص ۳۶
۴۴۔ ایضاً، ص ۴۷
۴۵۔ ایضاً، ص ۶۶
۴۶۔ سعد اللہ کلیم، ڈاکٹر، اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، جلد اوّل، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۳۵۱

۴۷۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص ۸۷

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۴۹۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۵ء، ص ۴۰

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۵۱۔ غالبؔ، اسداللہ، مرزا، کلیاتِ غالب، لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۴

۵۲۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، ص ۱۱۴

۵۳۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص ۱۰۳

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۸

۵۷۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، لاہور: المطبۃ العربیۃ پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱

۵۸۔ ایضاً، ص ۴۲

۵۹۔ ایضاً، ص ۴۸

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۱

۶۱۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص ۸۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۹۵

۶۳۔ ایضاً، ص ۹۹

۶۴۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، ص ۱۴

۶۵۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، ص ۱۱۹

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۶۷۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص ۴۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۴۷

۶۹۔ ایضاً، ص ۵۲

۷۰۔ ایضاً، ص ۷۷

۷۱۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، ص ۲۸

۷۲۔ ایضاً،ص۴۰

۷۳۔ ایضاً،ص۶۱

۷۴۔ ایضاً،ص۷۳

۷۵۔ ایضاً،ص۸۱

۷۶۔ سعداللہ کلیم،ڈاکٹر،اردوغزل کی تہذیبی وفکری بنیادیں،جلد دوم،ص۴۹۴

۷۷۔ عامر بن علی،سرگوشیاں،ص۸۵

۷۸۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص۱۷

۷۹۔ ایضاً،ص۲۴

۸۰۔ ایضاً،ص۴۸

۸۱۔ ایضاً،ص۵۴

۸۲۔ ایضاً،ص۷۸

۸۳۔ عامر بن علی،یاد نہ آئے کوئی،ص۱۱۸

۸۴۔ ادیب،مسعود حسن،سید،رضوی،ہماری شاعری،ص۲۷

۸۵۔ عامر بن علی،سرگوشیاں،ص۵۷

۸۶۔ ایضاً،ص۸۵

۸۷۔ ایضاً،ص۱۲۳

۸۸۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص۲۷

۸۹۔ ایضاً،ص۳۷

۹۰۔ ایضاً،ص۴۰

۹۱۔ ایضاً،ص۵۳

۹۲۔ ایضاً،ص۶۴

۹۳۔ ایضاً،ص۷۳

۹۴۔ ایضاً،ص۷۴

۹۵۔ ایضاً،ص۸۷

۹۶۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر،حسرت موہانی کی شاعری،مشمولہ: جدید شعری روایت،مرتبہ: الیاس میراں پوری، لاہور: بیکن بکس،

۲۰۱۲ء،ص۳۴

۹۷۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص۱۰۲

۹۸۔ عامر بن علی،یاد نہ آئے کوئی،ص۱۰۵

۹۹۔ عامر بن علی،چلو اقرار کرتے ہیں،ص۱۵

۱۰۰۔ ایضاً،ص۱۶

۱۰۱۔ ایضاً،ص۶۴

۱۰۲۔ سعداللہ کلیم،ڈاکٹر،اردو غزل کی تہذیبی وفکری بنیادیں،۲۱۸

۱۰۳۔ عامر بن علی،سرگوشیاں،ص۱۰۲

۱۰۴۔ ایضاً،ص۱۱۱

۱۰۵۔ عامر بن علی،یاد نہ آئے کوئی،ص۵۴

۱۰۶۔ ایضاً،ص۱۲۵

۱۰۷۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص۸۸

۱۰۸۔ ایضاً،ص۱۱۸

۱۰۹۔ عامر بن علی،چلو اقرار کرتے ہیں،ص۲۶

۱۱۰۔ ایضاً،ص۵۵

۱۱۱۔ ایضاً،ص۷۵

۱۱۲۔ عامر بن علی،سرگوشیاں،ص۷۹

۱۱۳۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص۳۱

۱۱۴۔ ایضاً،ص۴۶

۱۱۵۔ ایضاً،ص۶۴

۱۱۶۔ ایضاً،ص۷۶

۱۱۷۔ ایضاً،ص۷۷

۱۱۸۔ ایضاً،ص۱۰۰

۱۱۹۔ عامر بن علی،یاد نہ آئے کوئی،ص۱۲۵

۱۲۰۔ عامر بن علی،سرگوشیاں،ص۹۱

۱۲۱۔ ایضاً،ص۹۳

۱۲۲۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی،ص۱۱۶

۱۲۳۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص۳۷

۱۲۴۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں،ص۲۶

۱۲۵۔ ایضاً،ص۵۵

۱۲۶۔ عامر بن علی،سرگوشیاں،ص۹۲

۱۲۷۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی،ص۱۰۹

۱۲۸۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں،ص۲۷

۱۲۹۔ ایضاً،ص۷۵

۱۳۰۔ ایضاً،ص۸۰

۱۳۱۔ ایضاً،ص۲۳

۱۳۲۔ ایضاً،ص۳۲

۱۳۳۔ ایضاً،ص۴۹

۱۳۴۔ ایضاً،ص۶۵

۱۳۵۔ ادیب،مسعود حسن،سید،رضوی، ہماری شاعری،ص۲۰۹

۱۳۶۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص۱۱۷

۱۳۷۔ ایضاً،ص۱۱۴

۱۳۸۔ ایضاً،ص۱۲۱

۱۳۹۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں،ص۴۱

۱۴۰۔ سحاب،منصف خان،نگارستان، لاہور: مکتبہ جمال،۲۰۱۰ء،ص:۱۴۷

۱۴۱۔ انور جمال، پروفیسر،ادبی اصطلاحات،اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۲ء،ص:۱۸

۱۴۲۔ ابوالاعجاز،حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵ء،ص:۱۲

۱۴۳۔ کوثر،سعید الدین،مولانا،مخزن بلاغت، پشاور: کتب خانہ الضاریہ،س ن،ص:۴۲

۱۴۴۔ عامر بن علی،سرگوشیاں، لاہور:نستعلیق مطبوعات،اشاعت پنجم،۲۰۱۰ء،ص:۸۵

۱۴۵۔ ایضاً،ص:۱۰۵

۱۴۶۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۴۷
۱۴۷۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۴۷
۱۴۸۔ قمر نقوی، اُردو شاعری کی آخری کتاب، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء، ص:۱۱۶
۱۴۹۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت سوم، ۲۰۱۱ء، ص:۶۶
۱۵۰۔ ایضاً، ص:۶۷
۱۵۱۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۱۰۹
۱۵۲۔ سحاب، منصف خان، نگارستان، ص:۱۴۳
۱۵۳۔ کوثر، سعید الدین، مولانا، مخزن بلاغت، ص:۲۴
۱۵۴۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۶۴۔۶۳
۱۵۵۔ عابد، سید عابد علی، البیان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص:۸۸
۱۵۶۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۱۲۲
۱۵۷۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۶۷
۱۵۸۔ ابولاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۳۹
۱۵۹۔ سحاب، منصف خان، نگارستان، ص:۱۶۱
۱۶۰۔ عارف حسن خان، تلخیص بحر الفصاحت، لاہور: دار النوادر، ۲۰۱۶ء، ص:۳۷۱
۱۶۱۔ کوثر، سعید الدین، مولانا، مخزن بلاغت، ص:۴۱
۱۶۲۔ صہبائی، امام بخش، حدائق البلاغت، (ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر مزمل حسین)، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص:۱۱۸
۱۶۳۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۹۵
۱۶۴۔ ایضاً، ص:۱۱۲
۱۶۵۔ غالب، اسد اللہ خان، دیوان غالب، ص:۷
۱۶۶۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۲۷
۱۶۷۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص:۸۷
۱۶۸۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۸۷
۱۶۹۔ ایضاً، ص:۱۲۴۔۱۲۳
۱۷۰۔ ایضاً، ص:۱۰۹

۱۷۱۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۲۱
۱۷۲۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، ادبی مطالعات، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص:۱۱۹۔۱۱۸
۱۷۳۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۱۰۵
۱۷۴۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۱۱۳
۱۷۵۔ ایضاً، ص:۹۵
۱۷۶۔ غالب، اسداللہ خان، دیوان غالب، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اگست ۲۰۱۴ء، ص:۷
۱۷۷۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۵۲
۱۷۸۔ منصف خان سحاب، نگارستان، ص:۳۹۱
۱۷۹۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص:۶۷
۱۸۰۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۱۱۸
۱۸۱۔ ایضاً، ص:۱۰۶
۱۸۲۔ عارف حسن خان، تلخیص بحر الفصاحت، ص:۳۵۴
۱۸۳۔ منصف خان سحاب، نگارستان، ص:۱۷۶
۱۸۴۔ کوثر، مولانا سعید الدین، مخزن بلاغت، ص:۹۵
۱۸۵۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۸۸
۱۸۶۔ ایضاً، ص:۱۰۳
۱۸۷۔ ایضاً، ص:۱۲۰
۱۸۸۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۱۷۲۵۲
۱۸۹۔ کوثر، مولانا سعید الدین، مخزن بلاغت، ص:۱۰۳
۱۹۰۔ منصف خان سحاب، نگارستان، ص:۱۶۵
۱۹۱۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۱۶۹
۱۹۲۔ عارف حسن خان، تلخیص بحر الفصاحت، لاہور: دار النوادر، ۲۰۱۶ء، ص:۳۷۵
۱۹۳۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص:۱۵
۱۹۴۔ ایضاً، ص:۱۶
۱۹۵۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۸۶

۱۹۶۔ ایضاً،ص:۸۵

۱۹۷۔ ایضاً،ص:۸۹

۱۹۸۔ ایضاً،ص:۹۴

۱۹۹۔ افتخار شفیع،اصناف شاعری،لاہور: کتاب سرائے،۲۰۱۱ء،ص:۱۳۲

۲۰۰۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص:

۲۰۱۔ ایضاً،ص:۳۱

۲۰۲۔ ایضاً،ص:۳۹

۲۰۳۔ ایضاً،ص:۴۵

۲۰۴۔ ایضاً،ص:۶۸

۲۰۵۔ عامر بن علی،سرگوشیاں،ص:۱۲۱

۲۰۶۔ ایضاً،ص:۱۲۵

۲۰۷۔ انور جمال،پروفیسر،ادبی اصطلاحات،ص:۴۸

۲۰۸۔ اقبال،علامہ محمد،کلیاتِ اقبال،ص۶۱

۲۰۹۔ ایضاً،ص:۴۹۳

۲۱۰۔ عامر بن علی،سرگوشیاں،ص:۱۲۵

۲۱۱۔ ایضاً،ص:۱۰۵۔۱۰۶

۲۱۲۔ ایضاً،ص:۱۰۲۔۱۰۱

۲۱۳۔ ایضاً،ص:۱۱۸۔۱۱۷

۲۱۴۔ منو بھائی، بیک ٹائٹل،مشمولہ: سرگوشیاں، عامر بن علی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، جولائی ۲۰۱۰ء

۲۱۵۔ احمد عقیل روبی، کچھ سرگوشیاں کے بارے میں،مشمولہ: سرگوشیاں، عامر بن علی، لاہور: نستعلیق مطبوعات،۲۰۱۰ء،ص:۱۶

باب سوم

# عامر بن علی کی نظم کا فنی جائزہ

باب سوم

# نظم کا آغاز وارتقاء

لفظ نظم اُردو کی شعری اصطلاح میں دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ جب ''نظم ونثر'' کی ترکیب بولی یا لکھی جاتی ہے تو اس سے مراد ''نظم'' کی جملہ اصنافِ شاعری (غزل، نظم، قصیدہ، واسوخت، شہر آشوب، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) مراد لی جاتی ہیں۔ لیکن جب نظم وغزل کی بات ہو تو نظم سے مراد ایسی شاعری جس کے تمام اشعار میں معنوی ربط ہو اور اس کے تمام اشعار غزل کی ہیئت پر نہ ہوں لہٰذا نظم ایسی شاعری ہوتی ہے جس میں اوّل تا آخر تک کوئی مرکزی خیال پایا جائے۔

نظم کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے نظم کے لغوی و اصطلاحی مفاہیم کو سمجھنا از حد ضروری ہے لہٰذا ذیل میں چند تعریفات دی جاتی ہیں۔

فیروز اللغات کے مطابق:

''نظم: لڑی، مسلک، موزوں کلام، شعر، بندوبست اور انتظام ہے۔''(۱)

المنجد میں نظم کے معانی کچھ یوں ہیں:

''نظم، نظما، ونظاماً، موتی پرونا، آراستہ کرنا، موزوں کرنا، کسی چیز کو کسی چیز سے جوڑنا۔''

اُردو لغت تاریخی اصولوں پر میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لفظ نظم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نظم: لڑی، مسلک، مالا، موتیوں کو دھاگے میں پرونا، (ii) ترتیب ربط وضبط، تسلسل، (iii) عبارت کا ربط، ترتیب، جملے کی ساخت، اسلوب اندازِ بیاں، (iv) موزوں کلام، شاعری، شعر گوئی، شعر نثر کے مقابلے میں (v) شاعری کی وہ صنف جو کسی ایک خاص موضوع پر ہوتی ہے اس میں مسلسل اظہارِ خیال ہوتا ہے برخلاف غزل کے اس میں ہر شعر بالعموم ہم قافیہ ہوتا ہے بعض صورتوں میں ہم ردیف بھی ہوتا ہے۔ اس صنف کے لیے کوئی مخصوص بحر نہیں۔''(۳)

نظم عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لفظی معنی ''موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا'' کے ہیں لیکن ادب کی اصطلاح میں لفظوں کا معینہ ضابطوں کے مطابق استعمال ''نظم'' کہلاتا ہے اور یہ لفظ نثر کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح نظم اصطلاحِ شعر میں اشعار کے ایسے مجموعے کا نام ہے جس میں صرف ایک ہی خیال ادا کیا گیا ہو۔ اشعار کے زیادہ ہونے یا کسی فنی ضرورت کے تحت خیال کی بتدریج کو ظاہر کرنے کی غرض سے اشعار کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ غزل کے مقابلے میں نظم میں ایک ہی خیال اور ایک ہی مضمون کی وضاحت کی جاتی ہے اور اپنا مافی الضمیر قاری تک پہنچانے کی غرض سے بعض اوقات تکرار سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے لیے نہ تو ہیئت مقرر ہے اور نہ اشعار کی تعداد پر پابندی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اشعار کے داخل میں تسلسل خیال اور اشعار کا اندرونی ربط ضرور قائم رہے۔

## اصناف نظم کی حیثیت

اصنافِ نظم کو عام طور پر دو حیثیتوں سے تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ موضوعاتی لحاظ سے تقسیم

۲۔ ہیئتی اعتبار سے تقسیم

## موضوعاتی لحاظ سے نظم کی اقسام

موضوعاتی اعتبار سے نظم کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں۔ حمد، نعت، مناجات، منقبت، قصیدہ، غزل، مرثیہ، شہر آشوب، پیروڈی، گیت۔

## ہیئتی اعتبار سے نظم کی اقسام

مثنوی، رباعی، قطعہ، مسمط، ترکیب ہند، ترجیع بند، مستزاد، نظم معریٰ، سانیٹ، آزاد نظم، نثری نظم، دوہا، بارہ ماسہ، ہائیکو اور ماہیا وغیرہ۔

نظم خارجی شاعری سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کی ذات اور اس کے اندر کی دنیا سے کم اور باہر کی دنیا سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ خارجی شاعری عام طور پر بیانیہ ہوتی ہے جس میں مختلف واقعات وحوادث اور مختلف مناظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے شاعر اپنی شخصیت کو نظم کا حصہ نہیں بنا سکتا۔ یہ چیز روایتی نظموں پر تو صادق آسکتی

ہے۔آج کے جدید دور میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔نظم کے لیے جس طرح کسی ہیئت کی پابندی نہیں، اسی طرح نظم کے لیے کسی موضوع کی بھی پابندی نہیں۔کائنات اور انسان کے متعلق کسی بھی موضوع پر شاعر اپنے احساسات بہ صورت نظم بیان کرسکتا ہے۔اس میں حمد ونعت سے لے کر پیروڈی تک تمام موضوعات ادا کیے جاسکتے ہیں۔اسی طرح ہیئت کے اعتبار سے مثنوی سے لے کر نظم معریٰ تک تمام اظہار کے سانچے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''نظم ایک ایک رنگ، کیفیت اور تجربے کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔چنانچہ نظم مجموعی طور پر فرد اور اس کے باطن کی ایک کہانی ہے۔''(۴)

## اُردو نظم نگاری کا آغاز وارتقا

اُردو نظم نگاری کے آغاز کے بارے محققین کی کئی ایک آرا ہیں، کوئی بہمنی دور کو آغاز مانتا ہے تو کوئی دکنی دور کو۔البتہ اردو میں نظم نگاری کا آغاز بہمنی دور سے تسلیم کیا جائے تو معلوم شدہ نظموں کا انتساب بہت مشکوک ہے۔بعض محققین کی رائے ہے کہ نظم کا باقاعدہ آغاز سلطان قلی قطب شاہ کے دور سے ہوتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ نے باقاعدہ طور پر اپنے کلام کی تدوین کروائی۔نظم کے آغاز کے بارے میں غلام حسین ذوالفقار کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اُردو شاعری میں نظم کی بہت ساری مثالیں اصنافِ سخن میں بکھری نظر آجاتی ہیں۔سلطان محمد علی قطب شاہ (اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر) کے کلیات میں ہندوستان کے میلوں، تہواروں اور تقریبوں پر نظمیں موجود ہیں۔''(۵)

بعض محققین اس سے پہلے نظم کے آغاز کو مانتے ہیں کیونکہ قلی قطب شاہ سے پہلے کے دستیاب نمونے ریختہ کی صورت میں موجود تھے جن میں ایک پورا مصرع، آدھا مصرع، یا چند لفظ اُردو کے ہوا کرتے تھے۔اسی طرح کی نظمیں امیر خسرو اور بابا فرید گنج شکر سے بھی منسوب ہیں۔اس کے باوجود اکثر محققین قلی قطب شاہ کو ہی پہلا باقاعدہ نظم نگار مانتی ہے۔اوپر بیان کیے گئے بیان کی تائید اور محقق نظر عباس کی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''قدیم شعرا میں قلی قطب شاہ کہ جنہیں اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ان کے کلیات میں دوسو بیس نظمیں ملتی ہیں جن کے اشعار کی تعداد ایک ہزار چھ سو

انتالیس کے لگ بھگ ہے۔ان نظموں میں بیشتر یا تو مذہبی ہیں یا معاشرتی اور قومی۔
ان نظموں میں مذہبی تہواروں کا ذکر ہے۔موسموں کے بارے میں اس معاشرے کے
خصوصی ردِعمل کا ذکر اور معاشرتی حالات کی عکاسی ہے۔ پھر ان رسوم اور رواج کا
تذکرہ ہے جو اس وقت معاشرے میں موجود تھیں۔مجموعی طور پر یہ تمام نظمیں اس دور
میں دکنی معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی عکاس ہیں۔''(۶)

فلاسفہ یونان کہتے ہیں کہ شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں۔قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ انہیں اپنے مطلب کے موقع پر موزوں اظہار دیتا ہے۔اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔ جب صبح کا نور وظہور ہوتا ہے تو شاعر کبھی کہتا ہے کہ دیگر مشرق سے دودھ ابلنے لگا۔کبھی اس کو دریائے سیماب کے موج مارنے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔کبھی مشرق سے کافور کے اڑنے سے ملایا جاتا ہے۔اسی طرح شام کے منظر کو جب کوئی شاعر اپنے تخیل کا حصہ بناتا ہے تو شاعر اس کا اظہار شام کو شفق کی بہار دیکھنے سے کرتا ہے تو کبھی مغرب کے چھپر کھٹ میں آفتاب کے آرام کرنے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔گرمیوں کے گرم ترین سورج کے غروب ہونے کو جامِ فلک کا خون سے چھلکنا کہا جاتا ہے۔یا یہ کہ مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی ہے۔اسی طرح تاروں بھری رات کو دیکھتا ہے تو چاند کو لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکنے سے تشبیہ دیتا ہے۔کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے۔

غرض ایسی باتیں جو نہایت لطف دیتی ہیں مگر اصلیت سے انہیں کوئی غرض نہیں نظم کہلاتی ہیں۔اس حوالہ سے مولانا محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبِ حیات میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''ایسی باتیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں مگر اصلیت سے انہیں کچھ تعلق نہیں ہے۔ باوجود
اس کے صنعت گاہِ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنائع الٰہی سے ہے۔اسے دیکھ کر
عقل حیران ہوتی ہے کہ اوّل ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھتے ہیں اور نثر میں پڑھتے
ہیں۔پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس وپیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے تو کچھ اور ہی عالم
ہو جاتا ہے بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں:
ا۔وہ وصف خاص ہے کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں۔

۲۔کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے اور مضمون میں ایسی تیزی آ جاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے۔

۳۔سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔''(۷)

تجربات سے یہ واضح ہے کہ جب خوشی یا غم وغصہ یا کسی قسم کے ذوق وشوق کے خیال میں دل جوش مارتا ہے اور قوتِ بیان سے ٹکر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے، جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے۔اسی واسطے شاعر وہی ہے جس کی طبیعت میں یہ صنعت خدادا ہو۔قدرتی شاعر اگر چہ ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا مگر حقیقت میں اس کا دل اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔قدرت کے کارخانے میں جو چیز شاعر کے حواس میں محسوس ہوتی ہے اور اس کی طبیعت جو اثر لیتی ہے وہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔خواہ لطف وشگفتگی ہو خواہ آزردگی یا بیزاری۔یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ آپ اُٹھاتا ہے اس کے لیے ڈھونڈتا رہتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں اور کس طرح انہیں ترکیب دے تا کہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے شاعر کے دل پر طاری ہے وہ کیفیت سننے والوں کے دل پر چھا جائے اور جو بات کہے وہ دل پر اثر کر جائے۔

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق ہے کچھ نہ کچھ روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔اسی طرح کوئی زبان اپنے اہلِ زبان کی حیثیت کے بموجب نظم سے خالی نہیں رہ سکتی۔ ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادبی اپنی سرزمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے۔ زبانوں کے سلسلہ میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہلِ زبان کی شائستگی اور تہذیب علمی کے ساتھ لطافت طبع کے درجے دکھاتی ہے۔

اُردو نظم کی ولادت کے بارے مولٰنا محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبِ حیات میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

''زبان اُردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر باتیں کرنی سیکھے۔ ہاں نظم جوش طبع تھا اس لیے پہلے نکل پڑا۔نثر شائستگی کے بوجھ سے گراں بار تھی۔اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا۔نثر اُردو کی تصنیف ۱۱۴۵ھ سے پہلے نظر نہیں آتی

البتہ نظم کی حقیقت زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر یہ نکلتی ہے۔ جب
برج بھاشا نے اپنی وسعت اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی تو
طبیعتوں میں اس قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا لیکن وہ صدہا سال تک دوہڑوں کے
رنگ میں ظہور کرتی رہی یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی کے خیالات نہ آتے تھے۔''(۸)

نظم کے لفظی معنی موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے، ترتیب دینے، انتظام کرنے اور بندوبست کرنے کے ہیں۔ نظم کے مختلف بند ہوتے ہیں اور ہر بند مختلف مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر تین مصرعوں پر مشتمل ہو تو اسے مثلث کہا جاتا ہے۔ چار مصرعوں کا بند ہو تو مربع کہا جاتا ہے۔ پانچ مصرعوں پر مشتمل بند کو مخمس اور چھ والے کو مسدس کہتے ہیں۔ اگر مصرعوں کی تعداد آٹھ ہو تو مثمن اور دس ہو تو معشر کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نظم ترکیب بند اور ترجیع بند میں بھی کہی جاتی ہے۔ ترکیب بند وہ طویل نظم ہے جس کے کئی بند ہوں اور ہر بند میں چار، پانچ، چھ یا سات اشعار ہوں اور آخر میں ایک ٹیپ کا شعر ہو۔ ترجیع بند کی ہیئت بھی ترکیب کی طرح ہی ہوتی ہے۔ دونوں میں صرف فرق اتنا ہے کہ ترکیب بند میں ٹیپ کا مصرع یا شعر بدل جاتا ہے جب کہ ترجیع بند میں ٹیپ کا مصرع یا شعر بار بار دہرایا جاتا ہے اور وہ ہر بند کے اختتام پر ہوتا ہے۔

نظم کے لیے ہیئت کی کوئی پابندی نہیں اور نہ ہی موضوع کی کوئی قید ہے۔ نظم میں جہاں ہیئت کے لحاظ سے مثنوی سے لے کر نظم معریٰ تک کے تمام سانچے استعمال کیے جا سکتے ہیں وہاں حمد و نعت سے لے کر طنز و مزاح تک ہر ایک موضوع کو نظم میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم کا اپنا ایک وصف اور امتیاز ہے۔

ان نکات سے نظم کا معنوی روپ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ تاہم ایک دو باتوں کا اضافہ ان میں ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ نظم کی کوئی ہیئت مقرر نہیں اور نہ ہی اشعار کی تعداد پر پابندی ہے۔ البتہ جو بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ اشعار کے داخل میں خیال کا تسلسل اور اشعار کا اندرونی ربط ٹوٹنے نہ پائے۔ اسی طرح نظم کے لیے موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ شاعر کسی بھی موضوع سے متعلق اپنے احساسات کا اظہار نظم کی صورت میں کر سکتا ہے۔ ان حدود و قیود سے آزادی کے باعث ہی نظم نے اپنے آغاز سے اب تک جتنی ترقی موضوعات میں کی ہے اسی طرح وقت کے لحاظ سے اس کی ہیئت میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے اور اس نے مثنوی سے لے کر آزاد نظم تک بلکہ نثری نظم تک ہر سانچے میں خود کو ڈھالا ہے اور خود کا وجود درست طور پر ثابت کیا ہے۔

اردو ادب میں اگر نظم کے آغاز وارتقاء کی بات کی جائے تو یہ صنف اردو ادب کے آغاز سے ہی کسی نہ کسی صنف کے روپ میں ضرور موجود رہی ہے، اس حوالے سے مولٰنا محمد حسین آزاد آب حیات میں امیر خسرو کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنف وایجاد کا رکھتی تھی، ملک سخن میں برج باشا کی ترتیب سے ایک طلسم خانہ افشا پردرازی کا کھولا، خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی، اس میں فارسی بحروں نے اول اثر کیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب متروک ہیں، اس کے علاوہ بہت سے پہیلیاں عجیب وغریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک سے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا ہے کہ مکرانی، انمل دوسخنے عورتوں کے لیے گیت، ڈھکوسلا دوسخنے، نقل وغیرہ خاص ان کے آئینہ کا جوہر ہے۔''(۹)

## اردو نظم کی روایت

اردو کے دکنی دور میں بے شمار نظمیں موضوع کے اعتبار سے لکھی گئی۔ دکن کے علاوہ شمالی ہند کے بہت سے غزل گو شاعروں نے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور دیگر معین موضوعات پر شعر کہے ہیں مگر صحیح معنوں میں اردو نظم کا آغاز نظیر اکبر آبادی سے ہوتا ہے، وہ نہ صرف اردو نظم کے ربانی ہیں بلکہ ان کی نظموں کے موضوعات میں تنوع، وسعت اور رنگارنگی ہے، عوامی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں زبان وبیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی اور ان کا ذخیرہ الفاظ کافی وسیع تھا۔ انہوں نے ایسے موضوعات پر نظمیں لکھی کہ جن کے بارے میں کبھی بھی کسی شاعر کو خیال تک نہ آیا تھا، آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، برسات کی بہاریں، دنیا، پھر لی کی بہاریں، موتی، تربوز، آگرے کی تیراکی، تل کے لڈو جاڑے کی بہاریں، مفلسی، آئے دال کا بھاؤ اور چپاتی وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن سے ان کی زبان وبیان ہر قدرت کا پتا چلتا ہے ان کی نظمیں منظر کشی جذبات نگاری، جزئیات نگاری اور احساسات کی ترجمانی کے لحاظ سے بے مثال ہیں، ان کی نظموں میں مقامی رنگ ہے اور خوش باسی اور بے فکری کے علاوہ بے ثباتی، دنیا کا احساس جگہ جگہ پایا جاتا ہے، اگر تاریخ کے اوراق کی روگردانی کی جائے تو کچھ محققین نے اپنی آزء دی ہیں ان میں چند ایک ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

''اردو ادب کا آغاز ریختوں کی شکل میں ہوا تھا جس میں ایک مصرع ہندی اور دوسرا فارسی میں ہوتا تھا، ی پھر آدھا مصرع ہندی اور آدھا فارسی میں ہوتا ہے، ان ابتدائی ریختوں کے بعد سب سے پہلے جو نظمیں ہمارے سامنے آئیں وہ مختصر مثنویاں ہیں جن کا زمانہ نویں صدی سے گیارھویں صدی ہجری تک کا ہے، ان اولین نمونوں میں برج بھاشا کے ساتھ عربی اور فارسی کی آمیزش ملتی ہے، یہ نظمیں مثنوی کی شکل میں اور قدیم ترین مثنوی کا جو نمونہ دستیاب ہے وہ حضرت بابا فرید گنج شکر (متوفی ۶۶۴ ھ) سے منسوب ہے، اس کے بعد نظم کے حوالے سے حضرت امیر خسرو ر (۶۵۴۔۷۲۰ھ) کا نام آیا ہے، جن سے پہیلیاں، ان ملیاں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ جیسی مختصر اور چار مصرعوں والی نظمیں منسوب ہیں۔''(۱۰)

قلی قطب شاہ کے دور سے شروع بھرنے والی یہ نظم آج تک لکی جارہی ہے اور لکھی جاتی رہنے والی کے امکانات روشن ہیں اردو نظم جتنی تہذیبوں سے گزری شاید کوئی صنف اس حال سے متصف ہوئی ہو اس کی کئی ایک وجوہات ہیں، ایک یہ کہ اس میں باقاعدہ کوئی ہیت مقرب نہیں اور نہ کوئی موضوع کی قید مقرر ہے، یہی وجہ سے اس میں تجربات ہی تجربات ہوتے ہیں۔

اردو شاعری کا ابتدائی حصہ یا اثاثہ حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، مثنوی قصیدہ اور شہر آشوب، واسوخت، قطعہ اور باعی پر مشتمل ہے اور ان اصناف کی وجہ سے غواصی، رستمی، نصرتی، ابن نشاطی، محمود، بحری، ملا وجہی، حاتم، فغاں، میر درد، میر تقی میر، مصحفی، شاکر، تاجی، قائم چاند پوری، نظیر اکبر آبادی، انشاء، جرأت، سعادت یار خاں رنگیں، میر حسن، میر انیس، مرزا دبیر، ذوق، غالب، شیفتہ، پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ سے اپنے اپنے قصے کی شہرت پائی لیکن نظم کے جدید تصور کے قریب ترین بلا شرکت غیرے نظیر اکبر آبادی کی نئی نظمیں ہیں، دیگر کلاسیکی شعراء سے نظیر کی انفرادیت کو غلام حسین ذوالفقار یوں واضح کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''نظم کی جولان گاہ میں نظیر کے دھوار سخن نے اپنی جولانی طبع کے بے مثال جوہر دکھائے ہیں، اردو شاعری میں نظیر کا انفرادی مقام بھی دراصل ان نظموں کی بدولت ہے جن کے وسیع تر دامن میں انہوں نے زندگی کے تنوع اور نگارنگی کے پھول بھی اکھٹے کر

دیے ہیں اور کانٹے بھی۔''(۱۱)

نظم کا دوسرا دور ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کے قیام کے بعد آزاد اور حالی کی زیر قیادت شروع ہوتا ہے، جس کے تحت ۱۸۷۴ء میں نظمیہ مشاعروں کا آغاز ہوا، انیسویں صدی کے آخر میں سید احمد خان کی ادبی تحریک، مغربی خیالات کی اشاعت ونفوذ، انگریزی ادب کے نمونوں نے مل جل کر اردو شاعری میں ''نظم'' کے لیے سازگار ماحول مہیا کر دیا اور قدیم ادبی رجحانات کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی تھی، خواجہ الطاف حسین حالی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کے روایتی غزل گوئی کے خلاف آواز اٹھائی اور شعراء کو نظم نگاری کے طرف مائل کیا، اسی زمانے میں لاہور میں محکمہ تعلیمات پنجاب کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائیڈ کی زیر سرپرستی انجمن پنجاب قائم ہوئی، جس کے معتمد (سیکریٹری) محمد حسین آزاد تھے، اس انجمن کے تحت نئی طرز کے مشاعروں کی بنیاد رکھی گئی جن میں روایتی طور پر مصرع دینے کی بجائے موضوع تجویز کیا جاتا تھا اور شاعر اس موضوع پر شعروں کی صورت میں اپنے جذبات واحساسات پیش کرتے تھے، حالؔی نے اپنی چار نظمیں ''برکھارت، نشاطِ امید، مناظرہ رحم وانصاف، اور حب الوطنی'' اپنی مشاعروں میں پڑھی تھیں، ان مشاعروں سے اردو نظم نگاری کو فروغ ملا اور شاعر غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم گوئی کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔

حالی اور محمد حسین آزاد نے اردو شاعر میں نظم نگاری کی جس روشن کا آغاز کیا اس کی پیروی میں مشاعروں میں غزلوں کے علاوہ موضوعاتی نظمیں عام پڑھی جانے لگیں، شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، برج نرائن چکبست، سرور اور بے نظیر شاہ جیسے مشاعروں نے اردو ذخیرے کو رتلاطم موجوں سے لبریز کیا، نظم نگاری کی تحریک کو تقویت ملی تو بدلتے ہوئے سیاسی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی حالات کی عکاسی بھی اردو نظم میں ہونے لگی، مولنا ظفر علی خان، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض اور اختر شیرانی نے اردو نظم کو مزید وسعت دی، اس سلسلہ میں حفیظ جالندھری کا نام نمایاں ہے جن کی طویل نظم ''شاہنامہ اسلام'' اردو شاعری میں بیانیہ شاعری کے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اپنی بے مثال مشاعرانہ صلاحیتوں سے اردو نظم کو ایک نئی معنویت عطا کی، ان کی بعض نظموں مثلاً خضر راہ، طلوعِ اسلام، شکوہ، جواب شکوہ، ساقی نامہ، مسجد قرطبہ، ابلیس کی مجلس شوارٰی کا شمار اردو اور لازوال نظموں میں ہوتا ہے، انہوں نے نہ صرف اردو نظم کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا بلکہ ہیت کے اعتبار سے بھی نئے تجربات کے بہترین نمونے پیش کیے۔

دور حاضر میں جیسے جیسے فرد کی سوچوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ماحول کی اثر پذیری بھی بڑھتی۔ اردو نظم کے افق پھیلتے گئے اور وہ نظم جو پہلے صرف خارجی شاعری یا بیانیہ شاعری سمجھی جاتی تھی اب خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت کی بھی عکاسی کرنے لگی تھی، غم دوراں کے ساتھ غم جاناں بھی اس میں سمایا گیا تھا، اور جگ بیتی کے ساتھ ساتھ تو آپ بیتی کی چھلکیاں بھی پیش کرنے لگی تھی، اس ضمن میں ساحر لدھیانوی، مجاز لکھنوی، جان نثار اختر، علی سردار جعفری اور دیگر ترقی پسند شاعروں کی نظمیں بطور خاص قابل ذکر ہیں جنہوں نے مختلف مجلسی یا معاشرتی ناہمواریوں کو موضوع سخن بنایا گیا ہے اور ایسی سیاسی نظمیں لکھی گئیں جو اگرچہ سیاسی پروپیگنڈے کے ضمن میں آتی ہیں مگر اردو نظم کی تاریخ میں ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ترقی پسند شعراء کے منشی تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، جعفر طاہر، نعیم صدیقی، احمد ندیم قاسمی، عبدالعزیز خالد، شورش کاشمیری، عرش بھوپالی، شکیب جلالی، مختار صدیقی، ن۔م۔ راشد، میراجی، یوسف ظفر، انیس احمد ناگی، کشور ناہید، احمد فراز، پروین شاکر اور دیگر بہت سے شعراء اور شاعرات نے نظم کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے، ان کی بیشتر نظمیں تہذیبی، فکری اور سماجی نوعیت کے ہیں، ان میں روایت کی ہاسداری کا التزام بھی ملتا ہے اور ہیت کے نئے نئے تجربات کی بوقلمونی بھی نظر آتی ہے۔

اس دور میں شہرت پانے والے شعراء میں ایک بڑا نام مجید امجد کا ہے جن کا بنیادی طور پر تعلق ضلع جھنگ سے تھا اور چنیوٹ اس ضلع کی تحصیل کے طور پر کام کر رہا تھا، سال ۲۰۰۹ء میں چنیوٹ ایک الگ ضلع کی حیثیت اختیار کر گیا مجید امجد سے مشاہدے کو غیر معمولی بنانے اور بجھی ہوئی چنگاریوں سے روشنی کو ڈھونڈنے والے عہد آخریں شاعر تھے، انھوں نے موضوعات کی رنگارنگ کے ساتھ ہیت کے جو تجربات کیے وہ اپنی مثال آپ ہیں، نظم میں ان کا نام نمایاں ہے۔

شاعری اور بالخصوص نظم کے ان اودار نے شاعری کو عالمی ادب کے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور اردو نظم کا مقام و مرتبہ بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، شاعری میں نظم کا دور ایک سنہری باب ہے جس پر ہر دور میں ناز اور افتخار رہے گا۔

اردو نظم کے بارے یہ تصور عام ہے کہ اس پر غزل کے اثرات حاوی ہیں اور تا حال خالص نظم نہیں لکھی جا رہی، اس متنازع فیہ قول کے متاثرین وہ لوگ ہیں جو اردو نظم کو غیر ملکی زبانوں خصوصاً انگریزی نظم کے تناظر میں دیکھتے ہیں اور بعض نامعلوم وجوہ کی بناء پر اردو نظم و غزل کے ساتھ متعصّبانہ رویہ رکھتے ہوئے ہیں، پابند نظم تو ایک طرف رہی، آزاد نظم بھی ان کی اس غیر متوازن اور غیر حقیقت پسندانہ رویہ اور تنقید سے محفوظ نہیں رہ سکی، ایسے لوگ یہ بات فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ اول تو ہر زبان

کے ادب کی طرح اردو ادب کو بھی نظم اور نثر کے دو بڑے حصوں میں شمار کیا جاتا ہے اور غزل دراصل اصناف نظم میں شمار ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کی ماہیت، اوزان اور بحور کے سخت نظام اور مخصوص کیفیات واحساسات کی بناء پر اسے دیگر اصناف نظم کے مقابلے میں امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہی اس کی پہچان بن چکی ہے، دوسرے اردو شعراء ادب میں رواج پانے والی بہت سی اصناف نظم ونثر غیر ملکی زبانوں سے وارد ہوئے ہیں جو ہر حال اپنا الگ الگ منظر نامہ رکھتی ہیں، چنانچہ محض اور آہنگ کے اشتراک کی بنیاد پر اردو نظم خصوصاً آزاد نظم اور غزل کو ہمزاد قرار نہیں دیا جاسکتا یہ نہیں کیا جاسکتا کہ اردو نظم اور غزل کی چھاپ سے اردو نظم پابند ہو یا آزاد، وحدتِ فکر کی علمبردار ہے جب کہ غزل کی کا فکری انتشار واضح اور تسلیم شدہ ہے، پھر اردو نظم اور غزل کی مجموعی فضا ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہے کہ اردو کا ادنیٰ سا طالب علم بھی ان دونوں میں فرق کرسکتا ہے، اگر دیگر زبانوں کے ادب میں غزل ایسی صنف کا وجود ہوتا تو شاید ناقدین ان زبانوں کی نظم کے بارے میں اسی طرح کا خیال رکھتے، جو وہ اردو نظم وغزل کے بارے میں رکھتے ہیں، اصل یہ ہے کہ اگر وسیلہ اظہار یعنی زبان ایک ہی ہو تو شعر وادب کی مختلف اصناف میں مماثلتیں تلاش کر لینا کوئی شکل کام نہیں رہتا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان میں پہلے آزاد اور پھر نثری نظم کے رواج پانے میں شعراء کی اس خواہش کا دخل بھی ہے کہ وہ اپنی نظم کو ''غزل کے اثرات'' سے کُلی طور پر بچانا چاہتے ہیں اور خالص نظم کہنے کے آرزومند ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اب آزاد نظم کثرت سے لکھی جارہی ہے کہ پابند نظم کا تصور کرتے ہی یوں لگتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی کے دور میں سانس لے رہے ہیں۔

نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ غزل کو شعراء آزاد یا نثری نظم کی پوری پوری کتاب سامنے لا چکے ہیں، بعض جدید غزل کو نظیر اکبر آبادی کی نظم میں رنگنے کی سعی وکوشش میں بہ شدومد مصروف ہیں، گویا وہ غزل پر نظم کے اثرات کا نیا سوال اٹھانا چاہتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا مطمع نظر غزل اور نظم کو ایک دوسرے میں مدغم کرنا ہو مگر غزل کی مضبوط روایتی ساخت، موضوعاتی تنوع اور طرز واسلوب کی بناء پر یہ سعی، سعیٔ لاحاصل کے سوا کچھ ثابت نہ ہوگی۔

# عامر بن علی کی نظموں کا فکری پہلو

جس طرح اردو شاعری میں تخیل ایک اہمیت کا حامل ہے اسی طرح اس تخیل کو پروان چڑھانے کے لیے تجربات و مشاہدات بھی شاعر کے لیے اتنا ہی اہم ہوتا ہے۔ گویا کہ ایک شاعر اپنے تجربات ومشاہدات کی بنا پر اپنے تخیل کو مزید بلند سے بلند تر کرتا جاتا ہے۔ وہ اپنے تخیل کو پھر الفاظ کی مدد سے دوسروں تک پہنچاتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ یہی الفاظ جن کو شاعر نے تخیل دیا ہے۔ ہم اسے شاعری کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اب ہر شاعر کے اشعار میں ہم اسی تخلیل کا مطالعہ کر کے نئی سے نئی چیز نہ صرف ایجاد کر سکتے ہیں بلکہ مختلف افکار کو بھی فروغ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ تخیل خود بھی پرواز کرنے والے شے ہے اور وہ دوسرے انسانوں کو بھی پرواز کے روپ میں لے آتا ہے۔ گویا ہم شاعر کے شاعر سے تخیل کو دیکھ کر اپنے تخیل، سوچ وافکار کو مزید بلندی تک لے جا سکتے ہیں۔ یہی تخیل اشعار کے رنگ کو نکھارتا ہے۔

> ''تخیل کی رنگ آمیزی ہی کسی فنکار کے اسلوب اظہار کو حسن عطا نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لیے تجربے اور احساس کا خلوص بھی درکار ہے۔ جب بھی کوئی فنکار کسی خیال یا کیفیت کو بیان کرنے لگتا ہے تو شعوری کوشش کے بغیر اس میں اس کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ گویا فن کار کو زندگی کے صحیح شعور اور احساس دونوں میدانوں میں بیک وقت دوڑنا پڑتا ہے۔''(۱۲)

مسعود حسن ادیب رضوی کی اس رائے کو جب ہم عامر بن علی کی شاعری کے عکس میں دیکھتے ہیں تو اس کی شاعری ہمیں بالکل اسی عکس میں نظر آتی ہے۔ جس کا تذکرہ مسعود حسن رضوی نے کیا ہے کیونکہ وہ بھی روزمرہ کے تجربات اور مشاہدات ہی کو پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

خواب میں تھے
خواب سے آگے ہیں جو
درحقیقت

اب بھی ہیں وہ اک مسلسل جواب میں (۱۳)

عامر بن علی کی شاعری خاص طور پر نظم میں ہمیں فلسفیانہ مضامین نظر آتے ہیں۔ جو گہرے تخیل اور تجربات ومشاہدات کی آڑ میں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ان نظریات کو دنیا سے جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جو کچھ ہمارے روزمرہ میں ہوتا ہے۔ عامر انہیں کا تذکرہ اپنی شاعری میں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

## تصورِ عشق ومحبت

ہر شاعر کی طرح اس دنیا میں رہتے ہوئے عامر بھی اپنی شاعری میں محبت وعشق کا ایک غیر سنجیدہ سا تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق انسان کی زندگی کا ایک لازمی جز ہے جس کے بغیر انسان ایک اچھی زندگی گزارنے سے بہرحال قاصر نظر آتا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں عشق مجازی کی بات بار بار کرتے ہیں جیسا کہ وہ اپنی نظم ''آرزو'' میں لکھتے ہیں:

لاکھ کوئی ٹھکرا دے
سارے وعدے جھٹلا دے
توڑ کر سبھی بندھن
راہِ ہجر دکھلا دے
پھر بھی آس چاہت کی
آرزو محبت کی
دل سے تو نہیں جاتی (۱۴)

عامر کے نزدیک محبت میں کوئی بندھن نہیں ہوتا۔ وہ ہر حدود وقیود سے پاک ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کو حاصل کرنے میں کسی قید میں نہیں آتا۔ اس کا جو دل کرتا ہے وہ اسے سرانجام دیتا ہے۔ وہ ہر طرح کے کاموں میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔

شام اداسی لے آتی ہے
گھر کی ساری دیواروں پر
جس میں شامل بچھڑے یاروں

گزرے لمحوں کی چاہت
اور ہارے عشق کا ماتم بھی ہے
سب یہ ہمیں تڑپا دیتے ہیں(۱۵)

عاشق کے لیے شام کا وقت بہت اہم ہے وہ شام کو اداس ہوتا ہے اسے اس کے محبوب کی یاد آتی ہے۔ گویا کہ وہ اس شام کے وقت سے محبت اخذ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم جیون میں دیکھتے:

کسی کو کھو دینا
پیار کرنے
کسی پہ مرنے کا
ہم نے دستور کو نہیں مانا(۱۶)

عامر کہتے ہیں کہ یہ پیار تو یہ ہے کہ کسی کو اپنے پاس رکھ کر اس سے پیار کیا جائے اور اس سے بات کی جائے نہ کہ یہ پیار ہے کہ اپنے معنوں کی جدائی میں مر مر کے جینا اور نہ اس کو ملنا۔ گویا کہ عامر ہجر و وسال کے مضامین میں وصال کو پیار تسلیم کرتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے جان میری
تو ساری عمر نہ جان پائے گی پیار کیا ہے
اگر وہ خط تو سنبھال لینی
تو شاید اب تک تو جان جاتی کہ پیار کیا ہے(۱۷)

ایک عاشق کے خیالات ہی کو عامر اصل پیار گردانتے ہیں۔ اور وہ پیار عاشق کے خطوں میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ عامر اس بات کو بجا طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ اگر وہ مری بات سن لیتی یعنی میرا خط پڑھ لیتی تو تجھے پیار اور عشق کی سمجھ آتی۔

محبت کے سفر میں یوں تو کتنے ہی جزیرے تھے
جو دل کی آنکھ سے دیکھے

فراقِ یار میں لیکن
کسی کی کھوج میں تھا
اب مگر خود کو نہیں پاتا
کہاں میں آ گیا ہوں؟
کچھ بھی پہچانا نہیں جاتا(۱۸)

عامر بن علی محبت کے جزیروں کی بات کرتے ہیں۔ یعنی محبت میں انسان کہاں سے کہاں تک بھی چلا جاتا ہے لیکن ایک قید میں نہیں رہ سکتا۔ جزیرہ اداسی اور تنہائی کی ایک علامت ہے۔ لہٰذا عامر کے نزدیک لوگ جو محبت کے راستے پر چلتے ہیں وہ تنہائی اور اداسی ہی کے راستے پر ہوتے ہیں۔

''عشق کا جو معیار ہماری شاعری نے پیش نظر رکھا ہے وہ مجنوں و لیلیٰ، فرہاد و شیریں کا عشق ہے۔ ان کے عشق کی کہانیاں ہر زبان پر ہیں، مگر کیا ان کے کسی جز پر بھی نفس پرستی کی چھاؤں پڑتی ہے۔ اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ ہماری شاعری میں عشق سے خالص، پاک اور بے غرض محبت مراد ہے۔''(۱۹)

اگر ہم مندرجہ بالا اقتباس پر غور کریں تو ہمیں پتا چلے گا کہ عامر بن علی کی شاعری اس حقیقت کی عکاس ہے جو پاک محبت ہے اور اردو شاعری کی روایت میں بھی شامل ہے۔ عامر اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی محبت میں نفس پرستی اور نفسانی خواہشات کی پرچھائی نظر نہیں آتی۔ وہ اسی بے غرض محبت کی بات کرتے ہیں جو محبت کی تعریف کے بالکل قریب ہے۔

زمانہ اس لیے شاید
محبت کرنے والوں سے
ہمیشہ جلتا رہتا ہے
کہ چاہت میں بسے چہرے
سدا شاداب رہتے ہیں

محبت خواب دیتی ہے
جو جیون کو لبھاتے ہیں
محبت شاد رکھتی ہے
یہ دل آباد رکھتی ہے (۲۰)

عامر بن علی کے نزدیک انسان کو محبت میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو انسان چاہتا ہے۔ ان کے مطابق ایک انسان کے لیے خواب سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ محبت میں خواب دینے کے ناصح نظر آتے ہیں۔ محبت میں خوشی اور آباد رہنے کا عنصر ہر حال موجود ہے۔

محبت ایسا سچ ہے
جو ہمیشہ سے ہے دنیا میں
مگر پھر بھی پرانا ہو نہیں سکتا
کہ ہر اِک چاہنے والے کی چاہت اک نیا سچ ہے
محبت ایسا راستہ ہے جو قائم ہے ازل سے
پر اس کے سب مسافر
ہر قدم پر
ابھی تک تازگی محسوس کرتے ہیں (۲۱)

عامر محبت کو ہر چیز کا علاج گردانتے ہیں تو کیا معاشرے کا درست سمت اختیار کر بھی محبت ہی کے پیشِ نظر ہے۔

محبت ایسا سورج ہے
کہ جس کی ہر کرن دھرتی پہ پہلی بار اتری ہے
محبت جادوئی سا جذبہ ہے
کہ جب من میں اترتا ہے
تو دھڑکن وہ نہیں رہتی

یہ دل ایسے بدلتا ہے

عجب ہی معجزہ دیکھا

زمانے میں محبت کا(۲۲)

عامر بن علی محبت کو ایک سورج گردانتے ہیں جس کی کرنیں ہر کسی پر پرتی ہیں اور ہر کوئی اس روشنی سے مستفیض ہوتا ہے اور کوئی بھی اس سے بچ نہیں پاتا۔ اور اسی طرح ان کے نزدیک محبت ایک جادوئی جذبہ ہے۔ جو ہر کسی کو اپنے چنگل میں جکڑ لیتا ہے۔ پھر اس کا دل اس جادو کی زد میں ہے۔ عامر محبت کو ایک معجزہ گردانتے ہیں۔

ترا عشق وہ پارس پتھر

جس نے

مجھ سے بے وقعت کو

سونے میں تبدیل کیا تھا(۲۳)

عامر کے نزدیک یہ آدھا سچ ہے پورا سچ وہ اپنی نظم پارس ہی میں بیان کرتے ہیں کہ پارس خوش تو پتھر ہی رہتا ہے مگر وہ دوسروں کو سونا ضرور بنا دیتا ہے۔ عامر عشق و محبت میں اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ وہ اپنے محبوب سے عشق کر کے سونا بن چکے ہیں۔ جیسا کہ وہ اپنی ایک نظم صلہ میں پیار کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

تیرا محسن نہیں

میں عاشق ہوں

پیار احسان تو نہیں ہوتا(۲۴)

ایک خوبصورت تخیل پیار اور محبت کے لیے عاشق جنم دیتے ہیں۔ جس میں وہ محسن اور عاشق کو الگ الگ بیان کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ ان کے مطابق محبت میں کبھی احسان نہیں ہوتا۔

کڑی مشکلوں میں گھری تو ہے چاہت

مگر پھر بھی اب تک

محبت ہی ہے معتبر

جس کا دنیا میں سب سے بڑا نام ہے (۲۵)

عامر محبت کو معتبر گردانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ محبت کا سب سے دنیا میں بڑا نام ہے۔ لہٰذا اسے اپنایا جائے۔

دوزخ ہے جگہ وہ
کہ جہاں پیار نہیں ہے
اور سچ ہے
سبھی مملکت عشق کے باسی
دنیا میں تو رہتے ہیں
یہ جنت کے مکیں ہیں (۲۶)

عامر بن علی محبت والی جگہ کو جنت کہتے ہیں۔ اور جہاں محبت نہ ہو وہ جگہ دوزخ ہے۔ عامر محبت اور عشق کی وادیوں کو جنت سے استعارہ لیتے ہیں۔ گویا کہ محبت اور عشق والی جگہ میں آرام اور سکون ہے۔ جہاں محبت نہ ہو وہاں سکون میسر نہیں آتا۔ پھر یہ دنیا عامر کے نزدیک ایسی ہے:

یہ دنیا کتنی ظالم ہے
محبت کرنے والوں کا
بڑی نفرت سے تکتی ہے (۲۷)

محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں ہوتا مگر عامر کے نزدیک یہ معاشرہ محبت کرنے والوں کو ظالم اور جابر سمجھتا ہے۔ لوگ اس کی طرف نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ عامر کہتے ہیں کہ محبت جہاں ہو وہاں تو آلائشیں ہوتی ہیں۔ پھر کیوں محبت کرنے والوں کو مجرم اور ظالم قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے سے محبت ختم ہوگئی ہے۔ لوگ اس سے دور ہو کر ظالم ہوتے ہیں۔

## تصورِ زندگی

عامر بن علی کی شاعری میں ایک بڑا تصورِ زندگی کا ہمیں ملتا ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں کیا کیا نظریات رکھتے ہیں اور زندگی کو وہ کیا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ عامر زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے زندگی کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ اور اسے مشکلات والی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اسی مشکل میں ان کو خوبصورتی بھی نظر آتی ہے۔

زندگی کو دور سے دیکھا کرو
حسن اپنا دور سے دکھلائے گی
اور اگر نزدیک سے دیکھے گا تو
زندگی اک سانحہ بن جائے گی (۲۸)

عامر زندگی کو دور ہی سے دیکھنے کی بات کرتے ہیں۔ گویا یہ ایک فقیرانہ اور درویشانہ رویہ ان کے ہاں نظر آتا ہے۔

پڑا ایسے وقت سے واسطہ
کٹا ہر خوشی سے ہے رابطہ
جنھیں موت لگتی تھی دلربا
انہیں زندگی نے رلا دیا (۲۹)

زندگی کے راستے پر چلنا عامر کے نزدیک کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں مشکلات ہی مشکلات ہیں اور زندگی نے لوگوں کو اتنے دکھ دیے ہیں کہ وہ موت تک بھول گئے کیونکہ وہ لوگ دکھ اور مشکلات کو جھیلنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کو لگتا ہے کہ یہ دنیا اور زندگی ایسی ہی ہے اور اس چیز کا نام زندگی ہے۔ حالانکہ عامر اسے غلط قرار دیتے ہوئے لوگوں کو ایک نصیحت کرتے نظر آتے ہیں۔

ہم نے بچپن سے ہی سنا تھا یہی
جان سب سے عزیز ہوتی ہے
اس جہاں کے عظیم قلزم میں
زندگی اک حسین موتی ہے (۳۰)

عامر زندگی کو برا اور غلط کہنے والوں کو کرید کرید کر یہ پیغام دیتے ہیں کہ زندگی کوئی بری شے نہیں ہے۔ اگر ہم اسے اچھے طریقے سے گزاریں تو وہ خوبصورت ہے۔ بات ہمارے اپنے اوپر ہے۔ نظم ملال کیسا میں ہے:

میں زندگی گزار کے
چلا بھی گر گیا تو کیا

یہ زندگی زیاں نہیں (۳۱)

عامر اپنی اس نظم میں مزید آگے جا کر زندگی کے بارے میں اپنی سوچ بیان کرتے ہیں:

بھلا جہاں کیا کرے
یہ زیست اک فریب تھی
مگر یہ بات دل میں ہے
جو پیار میں گزر گئی (۳۲)

عامر کے ہاں زندگی کے بارے یہ بات بار بار نظر آتی ہے کہ لوگ زندگی تو فریب زدہ سمجھتے ہیں، مگر عامر زندگی کو خدا کی دی ہوئی ایک نعمت گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک خوبصورت احساس ہے۔

تھوڑا تھوڑا ابھی لکھوں جو
لفظوں کا بھرپور سمندر
اور اک جیون کتنا کم ہے (۳۳)

خوبصورت شے ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ عامر بھی زندگی کو چھوٹا کہتے ہیں۔ کیونکہ لوگ خود اسے اچھے طریقے سے نہیں گزارتے پھر زندگی کو برا کہتے ہیں۔ اگر اچھا سا گزاریں تو زندگی کسی برائی کا نام نہیں ہے۔

ساتھ جو ہوتا آج تمہارا
جیون کتنا سندر ہوتا (۳۴)

عامر کے نزدیک زندگی کی خوبصورتی تو محبوب کے ساتھ اور بھی بڑھ جاتی ہے، مگر ایسا وہ بالکل بھی نہیں سمجھتے کہ محبوب کے بغیر زندگی اچھی نہیں وہ تب بھی اچھی ہے لیکن محبوب کے ساتھ زیادہ خوبصورت ہے۔

زندگی کٹھن تو ہے
بے وطن پرندوں کی
بے زمین پودوں کی
اپنے دیس سے بچھڑے

بدنصیب لوگوں کی

پھر بھی جب بہار آئے (۳۵)

عامر کی نظم ''بہار کی ایک نظم'' بھی زندگی کو سمجھنے کے لیے اہم ہے جس میں وہ زندگی خوبصورت ان کی سمجھتے ہیں جن کو تمام سہولیات میسر ہیں۔ جیسے کہ اپنے دیس سے بچھڑے ہوئے لوگ اور ایسے پودے جن کو زمین نہ ملے اور ایسے پرندے جن کو وطن نہ ملے گویا عامر کے نزدیک آزادی ہی زندگی ہے۔

نفرتیں، پیار، دوست اور دشمن

چند جذبے ہیں اور کچھ رشتے

اپنے جیون کو جو بناتے ہیں

کامیابی کے قیمتی نسخے (۳۶)

عامر بن علی نفرت، دشمن اور برے جذبوں کو زندگی نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ تو پیار، دوستی اور اچھے جذبے کے احساس کو زندگی گردانتے ہیں۔ جو کافی حد تک ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ان کی نظم جیون میں دیکھیں:

ہم نے جذبوں کو زندگی جانا

ایک احساس دل کے ہونے کا

کہیں ہنسنے، کہیں پہ رونے کا (۳۷)

عامر اپنی اسی نظم میں آگے یوں بھی زندگی کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

سانس لینے

رگوں میں خوں چلنے

دل دھڑکنے

پلک جھپکنے کو

زندگی کی دلیل کم جانا

ہم نے جذبوں کو محترم جانا (۳۸)

لوگوں کے نزدیک سانس لینا، رگوں میں خون دوڑنا، دل کا دھڑکنا اور آنکھوں کا جھپکنا زندگی ہے مگر عامر کہتے ہیں کہ میں تو ایک اچھے اور سچے جذبے کو زندگی سمجھتا ہوں۔

یہی نتیجہ نکل رہا ہے
کہ اس پرانی غریب دنیا میں
تیری آنکھوں سے ملتی جلتی ہیں
صرف اور صرف تیری آنکھیں (۳۹)

جب عامر بن علی روشنی کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں تو وہ جگنو اور ستارہ کو بھی استعاراتی طور پر زندگی ہی کو لیتے ہیں مگر وہ اس روشنی کو کہیں کہیں مدھم اور کمزور دیکھتے ہیں جواب پرانی ہو چکی ہے۔ اسے پھر سے نیا اور تیز کیا جا سکتا ہے۔

کوئی جگنو، کوئی ستارہ
جو ہو سکے تو بچا کے رکھنا
اگرچہ راہیں بہت کٹھن ہیں
کہ چاندراتیں بھی جا چکی ہیں (۴۰)

عامر کہتے ہیں کہ اس روشنی کو پھر سے نیا کیا جائے۔ یہ زندگی تو ایک کٹھن راستہ ہے لیکن اس کٹھن راستے کو ہم خود سے خوبصورت بنا سکتے ہیں۔ عامر اپنی نظم آبلہ پا میں بیان کرتے ہیں:

یقین نہیں ہے
کہ زندگی کی مسافتوں کو
میں منزلوں تک بھی طے کروں گا (۴۱)

اسی طرح وہ اپنی نظم ''ایک الجھن'' میں نہ صرف زندگی کا حال لکھتے ہیں بلکہ زندگی کے متعلق یہ بھی بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کیسے گزری۔

یہ کہنا مشکل ہے
کیا بتاؤں

کہ کیسے گزری تھی
زندگی میری ہم سفر کی
کہ زندگی کی تمام خوشیاں
سمیٹ کر بھی جو خوش نہیں تھی (۴۲)

عامر یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگ زندگی میں کبھی خوش نہیں ہوتے۔ جن کو سب کچھ میسر آ بھی جائے وہ پھر بھی خوش نہیں ہوتے۔ ان کو زندگی پھر بری ہی لگتی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو زندگی میں تمام آلائشیں میسر نہیں آتیں، مگر وہ ہر وقت خوش و خرم رہتے ہیں۔ ان کا انداز اور رہن سہن ایک اچھے اور شاد جذبے والا ہوتا ہے۔ عامر کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو زندگی انتہائی زیادہ خوبصورت اور اچھی لگتی ہے۔ عامر لوگوں کو خوش رہنے ہی کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک خوشی ہی کا نام زندگی ہے۔

## تصورِ درد و غم

زندگی میں رہتے ہوئے ہر انسان کو مختلف مشکلات سے واسطہ ضرور پڑتا ہے۔ لہٰذا خوشی اور غمی انسان کی کیفیات میں سے لازمی جز ہے۔ ایک عاشق کو محبوب کا غم ہو سکتا ہے جسے ہمارے ہاں اردو شاعری میں سب سے زیادہ جگہ دی گئی ہے۔

''محبوب کے مفارقت کے غم میں باغ کی سیر سے عاشق کے دل پر جو اثر پڑتا ہے۔ اس
کا اظہار پورے طور پر ہو رہا ہے۔ شاعر کا بیان اس حقیقت پر مبنی ہے کہ جب دل غم سے
لبریز ہوتا ہے تو اسباب فرحت سامانِ وحشت بن جاتے ہیں۔''(۴۳)

مندرجہ بالا اقتباس میں جو خیال نظر پڑتا ہے عامر اسی کے گرد ہی گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بھی غم کو موت اور خوشی کو زندگی گردانتے ہیں۔ ان کی حالت تو اب یہ ہے کہ:

ذہن یوں لگے جیسے
اک غموں کی دلدل ہے (۴۴)

معاشرے میں مختلف معاملات سے مختلف غم ملتے ہیں۔ عامر کا ذہن غموں میں رہ رہ کر اب اسی میں گم ہو گیا ہے۔ وہ نکلنا چاہیں بھی تو اس سے نکلا نہیں جاتا۔

کبھی وصل کا جو خیال آئے تو خود بلائے

جو رہوں میں ہجر میں مبتلا تو اسے ذرا سا بھی غم نہ ہو
کہ میں کیسے حال میں قید ہوں
یہ تو اس کی مرضی کی بات ہے
کہ وہ جو کرے، رکھے جس طرح
تو میں کیا کہوں
تو میں کیا کروں
میرے بس میں کون سی بات ہے(۴۵)

عامر وصل کو زندگی تو سمجھتے ہیں بلکہ ایک اچھی زندگی مگر وہ ہجر کے غم کو موت بھی تصور نہیں کرتے کیونکہ ہجر میں محبوب کے ملنے کی ایک آس آدھی زندگی ہے۔اسی طرح وہ اپنی نظم شامِ غم میں کہتے ہیں:

اداس شام کے
بڑھتے ہوئے قدموں سے پریشان
اس آس پہ بیٹھے ہیں
کہ کب چاند ابھرے
اور بے چین نگاہوں میں بسی تنہائی
آسمان پر سجے تاروں سے کوئی بات کرے(۴۶)

عامر جب روشنی اور ستارے کو استعاراتی طور پر زندگی تصور کرتے ہیں تو روشنی نہ ملنے کا غم ان کی زندگی کو ختم کیے جاتا ہے۔ان کی شاعری میں ہمیں یہ سب سے بڑا غم نظر آتا ہے جو اسے وہ بار بار بیان کرتے ہیں کیونکہ ان کو معاشرے نے بہت زیادہ غم دیے ہیں۔

دل سے نہیں جاتا ہے
ایک لمحے کے لیے بھی
تیرے جانے کا ملال(۴۷)

محبوب کا ہجر اپنی جگہ قائم ہے۔ وہ اس ہجر سے دلبرداشتہ تو نہیں ہیں مگر اس کا غم ان کے ہاں ہمیں ضرور نظر آتا ہے کیوں کہ وہ اپنے دل کو غموں کا دلدل گردانتے ہیں۔ عامر بن علی کی نظم مشکل شخص پڑھنے سے ان کے ہاں غم کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

میں
تجھ کو کیسے
شریک غم کرلوں۔۔۔؟
میری سوچیں تو
تیری زلفوں سے بڑھ کر
پیچیدہ ہیں (۴۸)

عامر کی سوچ میں غم چھپا ہے۔ جس کا کوئی مداوا بھی نہیں ہے۔ اگر وہ اسے اپنے محبوب اور معاشرے کے ذریعے حل کرنا بھی چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔ عامر اپنے ''سویٹ ہارٹ'' کو نظم کا عنوان دیتے ہیں:

یا در پہ تمہارے بھی کوئی غم
کاندھوں پہ اٹھائے تنہائی
آواز لگائے، دستک دے
تم آجانا
کوئی اپنے خوف گنوا جانا
کچھ میرے درد بڑھا جانا
تم آجانا (۴۹)

وہ محبوب کو صدا دیتے ہیں کہ آج تم آجاؤ لیکن محبوب کے آنے سے ان کے غم میں کمی نہیں ہوگی بلکہ ان کے نزدیک اس کے آنے سے بھی غموں میں اضافہ ہی ہوگا۔ کیونکہ اب زندگی میں غم ہی کی ایک دولت ہے۔ جو عامر کے پاس باقی ہے۔

## تصورِ حسن و جمال

شاعر جب مشاہدات کرتا ہے تو کئی چیزوں کی خوبصورتی کو دیکھ کر ان کو اپنے تخیل کے مطابق پھر الفاظ میں بخشتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اردو شاعری میں محبوب کے حسن و جمال ہی کو اہمیت و فوقیت نظر آتی ہے۔ عامر بن علی بھی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ جہاں محبوب کا حسن بیان کرتے ہیں وہیں کائنات کی دوسری اشیاء کے حسن کو بھی بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

آسمان پر ستارے گھنے تھے بہت
چاند کا حسن بھی کم نہ تھا
مجھ سے کرتا تھا باتیں اکیلے میں جو
وہ مرا دلنشیں اور پیارا ستارہ کہاں سو گیا(۵۰)

جہاں عامر چاند کا نام لے کر اصل میں وہ اپنے محبوب ہی کا سراپا بیان کر رہے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کو کسی چاند سے کم نہیں گردانتے۔ اسی لیے وہ اپنے محبوب کو پیش کرتے ہیں:

اُن کے حسن اور خوشبو
رنگ و روپ میں کوئی
تھوڑی سی بھی
کمی نہیں ہوتی ہے
تو پھر نام تو جو بھی ہووے
نام میں کیا رکھا ہے(۵۱)

حسن نام اور پہچان اپنی آپ خود بناتا ہے۔ عامر کے مطابق نام اور پہچان حسن ہی سے جنم لیتے ہیں۔ جب حسن آئے گا تب نام اور پہچان دونوں ہی ایک انسان کو مل جائیں گے۔ اسی لیے عامر بن علی حسن کی نمائش اور اوصاف اپنے ہاں زیادہ بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

جن کے لفظوں میں تراشا ہے سراپا تیرا
میرے حرفوں میں ہے محفوظ ہر اک نقش ترا

کیسے بدلے گا زمانہ یہ سراپا یہ نقوش
تا ابد تیری جوانی تو رہے گی محفوظ
میری غزلوں میں، میری نظموں میں، مرے شعروں میں (۵۲)

عامر خود بھی اپنی نظموں میں اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ میں نے تیرا سراپا ہی تو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ میری نظموں میں اور ہے کیا۔ گویا کہ عامر بن علی اپنے اشعار میں محبوب کے حسن کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔

بہت دنوں سے تلاش میں ہوں
کہ تیری آنکھوں سے ملتی جلتی
کچھ ایسی شے اپنی زندگی میں
کہیں کبھی کوئی میں نے دیکھی
یا پھر کسی سے سنی (۵۳)

عامر اسی نظم میں اپنے محبوب کی آنکھوں کو مثال بنانے کے لیے کچھ چیز کی تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر ان کو یہ آنکھیں بے مثال نظر آتی ہیں۔ لہٰذا میں آگے جا کر لکھتے ہیں:

یہی نتیجہ نکل رہا ہے
کہ اس پرانی غریب دنیا میں
تیری آنکھوں سے ملتی جلتی آنکھیں
صرف اور صرف تیری آنکھیں (۵۴)

یہ دنیا اور زندگی عامر بن علی کے نزدیک مدھم اور کمزور ہے۔ اس میں وہ دم نہیں ہے۔ کیونکہ اس دنیا یا معاشرے سے ان کا محبوب چلا گیا ہے۔ گویا کہ عامر کے نزدیک یہ حسن صرف اور صرف ان کے معشوق ہی کے ساتھ ہے۔

اب کے یہ دن
بہت سے برسوں سے مختلف ہو
یہ پھول اپنی تمام خوشبو

حسین صورت کا ناز کر لے
تمہارے ہاتھوں کی سوندھی خوشبو
نہ پا سکیں گے (۵۵)

عامر کی نظموں میں ہمیں صرف اور صرف محبوب ہی کی خوبصورتی اور حسن نظر نہیں آتا بلکہ دن اور زندگی کی بھی وہ جگہ جگہ تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ محبوب کا حسن اور وصال ہے۔

اس دیوی کی چنچل مورت
اور نکھر کے آ جاتی ہے
کتنے ساون اور لگیں گے
اس چنچل کی پوجا کرتے
مجھ کو تو کچھ ہوش نہیں ہے (۵۶)

عامر بن علی کا محبوب بہت خوبصورت اور حسن والا ہے۔اس کے نقشہ کو عامر اپنی شاعری میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب کے وصال کے دن کو بھی وہ خوبصورت گردانتے ہیں۔اور جس زندگی میں ان کا محبوب انہیں میسر آیا ہے۔وہ معاشرے اور زندگی بھی خوبصورت ہے۔

## تصورِ انسان

ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق کیا سوچتا اور خیال کرتا ہے۔ایک شاعر اس پر بہت زیادہ افکار پیش کرتا ہے۔ عامر بن علی بھی ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری میں انسان کے متعلق اپنی سوچ و فکر ضرور پیش کرتے ہیں۔وہ انسان کو ظالم گردانتے ہیں۔

مرے چارہ گر تو بتا ذرا
مرے دوستوں کو یہ کیا ہوا؟
کہ ہیں سب کے چہرے بجھے بجھے
غم زندگی سے اٹے ہوئے (۵۷)

عامر سمجھتے ہیں کہ اب ایسا وقت ہے کہ جو دوست اور لوگ کبھی ہمدرد تھے۔ اب وہ ایک دوسرے کے دشمن ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو انس و محبت والا ہی پیدا کیا ہے، مگر آج انسان نے اپنی اس روایت کو قائم نہیں رکھا اور اپنا شمار ظالموں میں کر لیا ہے۔

کٹھن ہے جینا بچھڑ کے
مگر ملن کے لیے
ہم اپنی اپنی انا کے اسیر رہتے ہوئے
کریں گے کب کوئی کوشش (۵۸)

عامر انسان کو اس لیے برا کہتے ہیں کیونکہ انسان نے اپنی اپنی انا کو زیادہ اہمیت دینا شروع کی ہوئی ہے۔

اور تم جانتی ہو خوف کے آسیب میں قید
لوگ جی سکتے ہیں
محبت تو نہیں کر سکتے (۵۹)

اس معاشرے میں ایک واحد محبت کی کیفیت ہے جو لوگوں کو آسانیاں اور سہولیات فراہم کرتی ہے ورنہ لوگ اس معاشرے میں رہ نہ سکیں۔ عامر لوگوں کو اپنی نظم گزارش میں مخاطب کرتے ہیں:

مرے اس شہر کے اے باسیو!
مجھ کو نہیں تم سے عداوت کوئی بھی لیکن
تمہاری اپنی مرضی ہے
بھلے جیسے بھی تم سوچو
مگر اتنی گزارش ہے
مرے سپنوں کو مت توڑو
مجھے خوابوں میں رہنے دو (۶۰)

عامر کہتے ہیں کہ لوگ اس جہاں میں جیسے بھی رہیں اور جو بھی سوچیں مگر وہ دوسرے لوگوں کو تکلیف دینا چھوڑ دیں۔

لوگوں پر ظلم کرنا ترک کر دیں۔ پھر ہی یہ معاشرہ اچھائی والا معاشرہ بن سکتا ہے اس کے علاوہ نہیں۔ اسی طرح عامر کی نظم ''چراغِ محفل جلائے رکھنا'' میں کہتے ہیں:

مرے رفیقو!

مرے عزیزو!

تمہاری محفل کو چھوڑ کر میں

نہ جانے کتنے سمندروں کو عبور کر کے

اک اجنبی سے کسی جزیرے پہ آ کھڑا ہوں

اگر یہاں سے کوئی پرندہ

تمہاری بستی کا رخ کرے تو

عجب نہیں ہے

اڑان میں ہی

جو اس کے پر تک بھی ٹوٹ جائیں (۶۱)

جب انسان کو ایک معاشرے سے دکھ ملتے ہیں تو وہ اس معاشرے سے اپنا ناطہ توڑ دیتا ہے۔ عامر اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ یہاں تو ایک پرندہ بھی خوش نہیں ہے۔ اس کو بھی اُڑنے کے لیے پر میسر نہیں آتے کیونکہ یہ ظالم لوگ اس کے بھی پر کاٹ دیتے ہیں اور اُڑنے سے محروم کر دیتے ہیں۔

## تصورِ وقت

وقت کی رفتار کبھی کم نہیں ہوتی۔ عامر کی شاعری میں ہمیں وقت اس پیرائے میں نظر آتا ہے کہ اس وقت کی قدر کی جائے ورنہ یہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ عامر وقت کو روکنا چاہتے ہیں مگر وہ اس کو روک نہیں پاتے۔

جو زمیں کے ٹکڑوں کی

دوریوں سے اے جاناں!

وقت پیدا کرتا ہے

ایسے فاصلے اکثر

کٹ ہی جایا کرتے ہیں (۶۲)

وقت ایک ایسا دور ہے، جو انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ وہ کبھی تو انسان کو خوشی دیتا ہے اور کبھی غمی، کبھی محبوب کا ہجر دیتا ہے اور کبھی اس کے وصال سے سرفراز کرتا ہے گویا کہ عامر کے نزدیک یہ تمام کام وقت ہی پر منحصر ہے۔ جو کہ کبھی کسی کا نہیں بنتا۔

وقت کے صحرا میں بچھڑا ہم سے جو پھر کب ملا

ہے یہی اندازِ فطرت کا رواں سے کیا گلہ (۶۳)

وقت جیسے خود کبھی نہیں ملتا۔ عامر کہتے ہیں کہ ایسے ہی وہ بچھڑنے والوں کو بھی پھر کبھی نہیں ملنے دیتا اور یہ وقت کی باتیں ہیں جو کو عامر فطرت کا ایک انداز کہتے ہیں:

کیسے ممکن ہے حقیقت سے فرار

سوچتا جاتا ہوں کس درجہ بدل جاتا ہے

وقت کٹتا بھی دکھائی تو نہیں دیتا ہے (۶۴)

عامر اسی نظم ''سمے کی بات'' میں مزید آگے وقت کو یوں بھی بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

یوں تو بدلا ہے جہاں میں سب کچھ

اور کچھ زیست کے حالات بھی اب وہ نہ رہے (۶۵)

وقت جب تبدیل ہوتا ہے تب وہ ہر چیز کو تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ کوئی بھی وقت سے بچ نہیں پاتا۔ اسی طرح عامر کہتے ہیں کہ زندگی بھی وقت نے تبدیل کی ہے۔ حالات بدل دیے ہیں۔

خدا ہے شاہد بہت کڑا تھا وہ وقت لیکن

گزرتے لمحے بنے ہیں مرہم (۶۶)

عامر کے نزدیک وقت اچھا بھی آتا ہے اور برا بھی، مگر انسان اس کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اس وقت کو اچھا بنا سکتا ہے۔ پھر وہ وقت مرہم بنتا ہے۔ ان کی نظم ''سالِ نو'' میں ہے کہ:

یہ جو سال ہم سے جدا ہوا

بڑی مشکلوں سے ہی طے کیا

رہا پچھلے درد کا تذکرہ(۶۷)

اس نظم میں عامر مزید یوں بھی بیان کرتے ہیں:

نئے آنے والے برس میں کیا

جو گئی رتوں میں جدا ہوا

وہ خوشی کا لمحہ بھی آئے گا

یا کہ سالِ نو بھی اسی طرح

دکھی دلوں کا کرب بڑھا جائے گا(۶۸)

وقت کا بدلنا ایک فطرتی عمل ہے جو کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ گویا وقت گیا پھر واپس نہیں لوٹتا۔ اس لیے عامر بار بار اپنی شاعری میں وقت کی قدر کرنے کا کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

بے بس اس قدر بھی ہوتی ہے

بند مٹھی سے جیسے پھسلے ریت

وقت یوں ہاتھ سے نکلتا ہے

زندگی جن کے نام ہو وہ لوگ(۶۹)

عامر بن علی وقت کو ایک جانے والی چیز تصور کرتے ہیں۔ وہ بند مٹھی میں ریت کے ذروں سے وقت کو تشبیہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا وہ وقت کی قدر کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔

جب درد کی بارش تھم جائے

اور وقت کی دھڑکن جم جائے

پھر سوئے زخم جگا جاتا

تم آ جانا(۷۰)

وقت کی رفتار کبھی بھی کم نہیں ہوتی، مگر عامر وقت کی دھڑکن کے رکنے کا انتظار ضرور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ تب ان کے محبوب سے ان کی ملاقات متوقع ہے۔

سنا ہے وقت مرہم ہے
زمانے بھر کے زخموں کا
سو اِک دن بھر ہی جائیں گے
جو گھاؤ چھوڑ جاتے ہو(۷۱)

اسی طرح یہی خیال عامر اپنی نظم ''چلو ماضی میں چلتے ہیں'' میں بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

ہمارا آج کیسا ہے
کٹے گا کل کا دن کیسے
لگے انبار ہیں ایسے
زمانے بھر کی سوچوں کے
چلو ماضی کے صحرا سے
کچھ ایسے پل ہی چن لائیں
کہ جن سے دل بہل جائے(۷۲)

عامر بن علی کے ہاں وقت اپنی رفتار سے چلتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کسی کے لیے رُکتا نہیں ہے۔ عامر بھی اس کا مشاہدہ کر کے لوگوں کو اپنی شاعری میں اسے تجربے سے آگاہ کرتے ہیں کہ وقت کی قدر کرو۔ ورنہ یہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر پلٹ کر نہیں آئے گا۔

## عامر بن علی کی نظم کا فنی جائزہ

عامر بن علی کی نظمیں اس کی اپنی ہی ذات سے گفتگو کرتی ہیں۔ اس کا ہمزاد اس کی نظموں میں اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ عامر بن علی کی نظمیں اس بات کا یقین دلائیں گے کہ اُس کو سفرِ زیست میں جتنا مواد ملا اس نے اس کو حقیقت کے آئینے میں دیکھا اور بغیر کسی تصنع کے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ اُس نے اِس بات میں کہیں پر بھی حقیقت سے آنکھیں نہیں چرائی۔ عامر بن علی کی شخصیت، کردار کے حوالے سے عطاالحق قاسمی دیباچے میں لکھتے ہیں:

''عامر بن علی بہت ملنسار، ہنس مکھ اور محبتیں بانٹنے والا شاعر ہے۔نفرت اور منافقت سے آلودہ موجودہ ادبی فضا میں ایسے شاعروں کا وجود غنیمت ہے جو نہ صرف شاعری میں پیار اور محبت کی بات کرتے ہیں بلکہ خود اس کی عملی تصویر ہیں۔ عامر بن علی کو شعر سے کمٹمنٹ بہت مبارک ہو۔ میں اس کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔''(۷۳)

عامر بن علی کی نظموں میں فنی کمالات کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے ہم ان کی تخلیق کردہ نظموں کو فنی اعتبار سے جانچتے ہیں اور اُن کے علمی و ادبی قدر جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

## تشبیہ

کسی بھی ادب پارے میں کسی شے کا ذکر اور پھر مشترک خصوصیات کی بنا پر دوسری شے جیسا قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے۔ منصف خان سحاب لکھتے ہیں:

''تشبیہ کے لفظی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینے کے ہیں۔علم بیان کی رُو سے جب ایک چیز کو کسی مشترک خصوصیات کی بنا پر دوسری چیز کی مانند قرار دیا جائے جبکہ وہ دوسری چیز میں زیادہ پائی جائے تو اُسے تشبیہ کہتے ہیں۔''(۷۴)

مولانا سعید الدین کے مطابق:

''بسا اوقات کسی چیز کے متعلق اپنے مدعا اور ماضی الضمیر کو پورے طور پر ادا کرنے کے لیے کلام میں ایک چیز کو کسی دوسری چیز جیسا قرار دیا جاتا ہے اظہار مدعا کے اس طریقے کو تشبیہ کہتے ہیں۔''(۷۵)

پروفیسر انور جمال ادبی اصطلاحات میں تشبیہ کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

''تشبیہ انسانی کلام کی ایسی خصوصیات ہے جو کائنات کے مشابہتی رشتوں کو تلاش کرتی ہے۔اس کا مدعا دنیا کے تفرقوں میں وسیع تر ہم آہنگی کا اثرات ہے۔تشبیہ میں ایک چیز کو ایک یا ایک سے زیادہ مشترک خصوصیات کی بناء پر دوسری کی مانند قرار دیا جاتا ہے اور اس طرح پہلی چیز کی اہمیت یا شدت کو واضح کیا جاتا ہے۔''(۷۶)

سید عابد علی عابد تشبیہ کی تعریف ''البیان'' میں کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''تشبیہ وہ فن ہے جس کے ذریعے فنکار، انشا پرداز یا خطیب مختلف چیزوں میں
مشابہتیں دریافت کرتا ہے۔''(۷۷)

عامر بن علی کی نظموں میں مختلف فنی اصطلاحات موجود ہیں۔تشبیہ کے حوالے سے عامر بن علی کی نظم سے چند مثالیں پیش ہیں:

جب آنکھوں میں
کرچی کرچی خواب پگھل کر
آنسو بننے لگتے ہیں تو
بھیگی پلکوں سے ہم گھر کے
خالی پن کو یوں ہی تکنے لگ جاتے ہیں
ہم تنہا تو تھے ہی لیکن
شام احساس بڑھا جاتی ہے
شام اداسی لے آتی ہے(۷۸)

اس نظم میں شاعر نے آنکھوں کے آنسوؤں کو کرچی کرچی خوابوں کے بکھرنے سے تشبیہ دی ہے۔بھیگی پلکوں سے گھر کے خالی پن تک اور خالی پن کو شام کی اُداسی سے تشبیہ دی ہے۔اس نظم میں عامر بن علی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔ایک اور نظم کی مثال دیکھیے:

کوئی دروازہ کھلتا ہے نیا
محسوس ہوتا ہے
دوبارہ اک نئی دنیا کا
لگتا ہے جہاں بدلا
کوئی جب پیار کرتا ہے

تو جھرنے پھوٹنے لگتے ہیں(۷۹)

اس مثال میں اک دروازہ کھلنے کو نئی دنیا کے بدلنے سے تشبیہ دی ہے اور اس مثال کے آخری مصرعے میں ''جھرنے پھوٹنے لگتے ہیں'' سے بھی تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔اسی حوالے سے ایک اور تشبیہ کی مثال دیکھیے:

چاہے ہزار سال جیوں
چاہے نہ کل رہوں
بھولوں گا نہ کبھی تجھے
جب تک ہے دم میں دم
ساون کی چاندرات کے رنگوں کی ہے قسم(۸۰)

اس نظم میں ''ساون کی چاندرات کے رنگوں کی ہے قسم'' سے تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔ان کی نظموں سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کمال فن میں ایک پختہ شاعر ہیں وہ نوجوانی میں ہے۔اپنی شاعری کو ادبی اصطلاحات سے مزین کرتے نظر آتے ہیں۔

## استعارہ

منصف خان سحاب، استعارہ کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینا اور اصلاح میں جب کوئی اپنے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور حقیقی اور مجازی میں تشبیہ کا تعلق موجود ہو تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔''(۸۱)

پروفیسر انور جمال کے مطابق:

''کسی شے کے لوازمات اور خصوصیات کو کسی دوسری شے سے منسوب کرنا، استعارہ ہے۔لفظ کو مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کرنا کہ حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔''(۸۲)

استعارہ کی بنیاد اگرچہ تشبیہ پر ہی ہے مگر فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں ایک چیز کو کسی دوسری کی مانند قرار دیا جاتا ہے جبکہ

استعارہ میں ایک چیز کو ہو بہو دوسری چیز قرار دیا جاتا ہے اور اس دوسری چیز کے لوازمات پہلی چیز سے منشوب کر دیے جاتے ہیں۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں حفیظ صدیقی کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''استعارہ کے لغوی معنی کسی سے کوئی چیز عاریتاً طلب کرنے کے ہیں۔ علم بیان کی اصطلاح میں استعارہ سے مراد وہ لفظ ہے جو مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔ جب کہ بہادر آدمی، سنم کہہ کر محبوب اور چاند کہہ کر بیٹا مراد لیا جائے تو یہ استعارہ ہے شاہ حسین ہنیری کو ٹھڑی کہہ کر قبر، کالا ہرن کہہ کر نفس امارہ اور چرغہ کہہ کر جسم انسانی مراد لیتے ہیں۔ یہ سب استعارے ہیں۔''(۸۳)

استعارہ کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ کیجیے:

۱۔ تم خوبصورت ہو۔ (سادہ جملہ)

۲۔ تم چاند کی طرح خوبصورت ہو۔ (تشبیہ)

۳۔ تم چاند ہو۔ (استعارہ)

اسی طرح کسی دلیر، نڈر انسان کو شیر کہنا اور کسی فیاض اور سخی کو حاتم طائی کہہ دینا یہ اوصاف انسان یا چیز سے منسوب کر دیے جاتے ہیں۔ صاحب مخزن بلاغت کچھ یوں استعارے کی تعریف کرتے ہیں:

''لفظ کو ایسے مجازی معنے کے لیے استعمال کرنا جو لفظ کے حقیقی معنے (مصداق حقیقی) سے تشبیہ کا تعلق رکھتے ہوں۔ یعنی معنے حقیقی اور معنے مجازی یا ہم مشبہ بہ اور شبہ کی حیثیت رکھتے ہوں لیکن کلام میں تشبیہ نہ دی گئی ہو، استعارہ کہلاتا ہے۔''(۸۴)

عامر بن علی کی نظموں میں بھی فنی کمالات خوب نظر آتے ہیں۔ استعارے کی چند مثالیں ملاحظہ کریں:

ہر موسم میں شہر کو تیرے
خوشی کا ایک جزیرہ سمجھا
تیرے بن ساون کو سوکھا

چاندنی رات کو تیرہ سمجھا
شاید نظروں کا دھوکہ تھا
میں شیشے کو ہیرا سمجھا(۸۵)

شاعر نے ہیرا کو شیشہ اور شیشے کو ہیرا بطور استعارہ قرار دیا ہے اور استعارہ میں آپ کسی چیز کو بالکل وہی قرار دیتا ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

یہ شہر تو ہے برف کا
باسی ہیں اس کے موسم کے
صدیاں ہوئیں اس کو بسے
لیکن یہ جس دن سے بنا
تاریکیوں میں غرق ہے
خاموشیوں کا راج ہے
اس شہر کے لہرا اک طرف
اس شہر کے اے باسیو
اک بات تو میری سنو
تم تو بنے ہو موم سے(۸۶)

برف کا شہر، موم کے باسی وغیرہ کے الفاظ استعارے کے اشارے ہیں۔ شاعر نے شہر کے باسیوں کو موم اور برف کے بنے ہوئے قرار دے دیا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے:

بہت حیران ہوتا ہوں
کسی سے جب یہ سنتا ہوں
کہ تو راتوں کو تنہا دیر تک تاروں کی چھاؤں میں
اب اکثر اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا خواب بُنتا ہے

میں اکثر سوچتا ہوں تو ملے تو تجھ سے یہ پوچھوں
اندھیروں سے تمہاری دوستی کیسے ہوئی ہمدم
تمہیں تو شام کی پرچھائیوں سے خوف آتا تھا(۸۷)

اس مثال میں ''خواب بننا'' استعارے کی مثال ہے اور اس کا پس منظر بڑے اچھے انداز میں شاعر نے پیش کیا ہے کہ جب انسان کسی کا انتظار کرتا ہو اور پھر وہ راتوں کو دیر تک تاروں کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے خواب بننا شروع کرتا ہے۔

## تلمیح

تلمیح عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ (ل م ح) ہے اور اس کا تعلق باب تفعیل سے ہے اور اس کے لغوی معنی کا اشارہ کرنا کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں یہ لفظ و اصطلاح ماضی و تاریخ کے کسی مشہور واقعے کی طرف محض اشارہ کرتا ہے جس کو پڑھتے یا سنتے ہی انسان کے ذہن میں پورا واقعہ آجاتا ہے اور یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس سے ہم ماضی میں جھانک سکتے ہیں۔ یہ ایک ہی لفظ سمندر کی سی وسعت رکھتا ہے اور اس کا ظرف بے حد وسیع و عریض ہے۔ ادبی اصطلاح میں کلام میں کسی تاریخی واقعے، قصے یا روایت کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کا تعلق شاعری اور نثر دونوں سے ہے۔ تلمیح کا فن کلام میں بلاغت پیدا کرتا ہے اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ چند لفظوں میں ایک طویل بیان چند سطروں میں سمٹ آتا ہے اور پڑھنے و سننے والوں کی چشمِ تخیّل میں سارا منظر گھوم جاتا ہے۔ تلمیح کے حوالے سے ادبی اصطلاحات میں پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''کلام میں کوئی ایسا لفظ یا مرکب استعمال کرنا جو کسی تاریخی، مذہبی یا معاشرتی واقعے کی طرف اشارہ کرے، تلمیح کہلاتا ہے۔''(۸۸)

ادب میں شعرا اور ادبا نے اپنے کلام میں کسی مشہور بات، روایت، واقعہ، قصہ یا کسی تاریخی واقعی کی طرف اشارہ کرنا۔ تاریخی واقعات کے علاوہ حدیث نبوی ﷺ یا کسی تاریخی قرآنی آیت کی طرف اشارہ کرنا بھی تلمیح کہلاتا ہے۔ چند مشہور تلمیحات درج ذیل ہیں:

۱۔ آتش نمرود ۲۔ آب حیات ۳۔ خضر اور سکندر
۴۔ گلزار ابراہیمؑ ۵۔ چاہ یوسف ۶۔ ابن مریم

۷۔ برادران یوسف وغیرہ

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصطلاحات میں تحریر کرتے ہیں:

''زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کو بنانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا اور لمبے لمبے قصوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص لفظوں کے ذریعے اشارے ہونے لگے۔۔۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصے وہ واقعے آنکھوں کے سامنے بھر گئے اور ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔''(۸۹)

قمر نقوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''کلام میں کسی واقعے، شخصیت یا قصے وغیرہ کی طرف اس طرح اشارہ کرنا کہ قاری کے ذہن میں سارے واقعے یا شخصیت یا قصے کا نقشہ قریب ہو جائے۔''(۹۰)

عامر بن علی کی شاعری میں جہاں دیگر فنی لوازمات اپنے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ وہیں صنعت تلمیح بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ شاعری میں جلوہ فگن ہوتی ہے۔ اُن کی ایک نظم دخترِ مشرق اس کی مثال ہے۔ ملاحظہ ہو:

کتنے درد اُٹھائے تو نے
میرے دیس میں پیدا ہو کر
اے مشرق کی پیاری بیٹی
پیار تھا تجھ کو مظلوموں سے
محکوموں اور خستہ تنوں سے
جن کے نام تھا جیون تیرا
موت بھی ان کے سامنے آئی
راول پنڈی کے کونے میں
کل ہی تو مصلوب ہوا تھا(۹۱)

اس نظم میں شاعر نے بے نظیر بھٹو کے حوالے سے صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے کہ اس نے یہاں پیدا ہو کہ اس وطن کے باشندوں سے پیار کر کے اپنی موت کو گلے لگایا اور شاعر نے راول پنڈی کو کوفے سے تشبیہ دی ہے اور پنڈی کو کوفہ ہی سمجھا ہے اس نظم کو پڑھنے کے بعد فوراً ہمارے ذہن میں بے نظیر بھٹو کی سیاسی جدو جہد اور اس کے مقتل کے واقعات ذہن میں تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے:

تیرا بابا
نوڈیرو کے قبرستاں میں
ناحق خون بہا کر سوئے
جری، بہادر تیرے بھائی
جن کا ماتم جاری ہی تھا
اور وطن نے
میرے عہد کی زینبؓ تیرا مقتل دیکھا(۹۲)

اس مثال میں بے نظیر بھٹو کے والد گرامی ذوالفقار علی بھٹو کی وفات کے حوالے سے ہے۔ اس مثال میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مزید ملاحظہ کیجیے:

وہ جن کے خیمے جل گئے
ہیں وہ جمال زندگی جو موت سے نہیں مٹے
ہے جن سے دین مغیر
انہیں مرا سلام ہو
تھا انقلاب کی بنا
حسینؓ کا وہ کارواں
وہ جن لبوں سے حرف حق نہ موت سے بھی چھین سکے
وہ نیزوں کی ان پر سر

انہیں مرا سلام ہو

انہیں مرا سلام ہو(۹۳)

اس نظم میں شاعر نے حضرت امام حسینؓ اور ان کے جاں نثاروں کو سلام عقیدت بھی پیش کیا ہے اور ان کے واقعات کو تلمیح کے انداز میں پیش کیا ہے۔ عامر بن علی نے بڑے خوبصورت انداز میں واقعہ کربلا کو تلمیحاتی انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کے فن کی پختگی نظر آتی ہے جو قاری ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد ان کو دادِ تحسین دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

## صنعت تضاد

اس کو صنعت تضاد اور صنعت طباقبھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد کہ ایسے الفاظ استعمال میں لائیں جائیں جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے فی الجملہ ضد اور مقابل ہوں۔ پروفیسر انور جمال صنعت تضاد کے بارے لکھتے ہیں:

''(شعری صنعت ہے) جب کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں اور مقابلی ہوں۔''(۹۴)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کے مطابق:

''علم بدیع کی اصطلاح میں تضاد کے معنی ہیں ایسے الفاظ استعمال میں لانا جن کے معنی ایک دوسرے کی ضد اور مقابل ہوں۔''(۹۵)

منصف خان سحاب ''نگارستان'' میں لکھتے ہیں:

''کلام میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ لانا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔''(۹۶)

عارف حسن خان صنعت تضاد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''صنعت طباق، اس کو صنعت تضاد اور مطابقت بھی کہتے ہیں یعنی ایسے الفاظ استعمال میں لائیں جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے فی الجملہ ضد اور مقابل ہوں۔''(۹۷)

مولانا سعید الدین کوثر اس کے حوالے سے کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''کلام میں دو ایسے معنے لائے جائیں جو ایک دوسرے کے مقابل نوعیت کے ہوں۔''(۹۸)

شاعر،شاعری میں اورادیب نثر میں ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جوایک دوسرے کے بالکل مخالف ہوں مثلاً:

آنا، جانا۔خوشی،غم۔رونا، ہنسنا۔دن، رات۔پستی، بلندی۔نشیب،فراز۔عروج، زوال۔امام بخش صہبائی ''حدائق البلاغت''میں اس صنعت کے مزید نام بھی بتاتے ہیں اور کچھ یوں تعریف کرتے ہیں:

''اس کو طباق،طبیق، مطابقت اور تکافو بھی کہتے ہیں۔ یہ صنعت اس طرح سے ہے کہ
کسی لفظ کے معنی دوسرے لفظ کے مخالف ہوں۔''(۹۹)

عامر بن علی نے اپنی نظموں میں بھی اپنے فنی کمالات کا مظاہرہ بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو:

میں بہت ہی بزدل تھا
اور کم سخن سا بھی
تو بہت بہادر تھی
اور جان محفل بھی
صد ہزار لوگوں کے
تنہا دل کی دھڑکن بھی
میں بہت ہی بزدل تھا
اتنا بھی نہ کہہ پایا
تجھ پہ میری جاں واری
تو بہت ہی ہے پیاری(۱۰۰)

## سوالیہ انداز

اس سے مراد ہے کہ کلام میں سوال کی صورت شعر کہا جائے۔ مثال کے طور پر مرزا غالب کے دیوان کا پہلا شعر ہی اپنے اندر ایسا خلا رکھتا ہے جو شاید آج بھی پورا نہیں کیا جا سکا۔ وہ شعر آج بھی ذات و کائنات کے بارے بہت سے سوالات اُٹھاتا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا(۱۰۱)

شاعری کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شاعری صرف قاری کو لطف اندوز، محظوظ کرنے اور اس کے لیے مسرت کا باعث بنتی ہے لیکن یہ باتیں محض ابتدائی سطح پر درست ثابت ہوتی ہیں، مگر جب شاعری کو اعلیٰ فکری وفنی مدارج کی انتہا پر پہلے پرکھا جاتا اور سمجھا جاتا ہے تو شاعری ذات کا ایسا خلا ہے جو شاعر کے اندر موجود ہوتا ہے اور شاعر اس خلا کو فنکارانہ مہارت سے قاری کے سامنے کچھ اس انداز سے رکھتا ہے کہ بعض اوقات اس خلا کو بھرنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔

استفہامیہ انداز سے بھی عامر بن علی اپنی نظموں کو بھی مزید کیا ہے۔ اس صنعت کی مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

میں چپ ہوں گرچہ
مگر مری جاں!
گئی رتوں کا
کوئی جو تم سے حساب پوچھے
تو کیا کہو گی۔۔۔؟(۱۰۲)

اس مثال میں ''تو کیا کہو گی'' کے الفاظ استفہامیہ انداز میں ملتے ہیں۔ مزید مثال ملاحظہ ہو:

آسماں پر ستارے گھنے تھے بہت
چاند کا حسن بھی کم نہ تھا
مجھ سے کرتا تھا باتیں اکیلے میں جو
وہ مرا دلنشیں اور پیارا ستارہ کہاں ہو گیا
جانے کیوں یہ لگے
اُس کے دم سے تھیں راتوں کی سب رونقیں
رونق شہید ہی تھی
مگر وہ گئی تو نظارا کہاں کھو گیا؟

چاند کا حسن سارا کہاں کھو گیا؟(۱۰۳)

اس مثال میں تین چار مصرعوں میں صنعت استفہامیہ سے مزین ہیں۔ایک اور مثال دیکھیے :

گھیرے میں تم ہو برف کے
سوچو جو تم سے ہو سکے
تاریکیوں کو چیرتا
سورج کہیں سے آ گیا
تو کیا بنے گا شہر کا۔۔۔؟(۱۰۴)

اس مثال میں آخری مصرعہ میں صنعت استفہامیہ موجود ہے۔

## سہل ممتنع

لغوی اعتبار سے سہلِ ممتنع اور ممتنع مشکل اور دُشوار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اِصلاح شاعری میں ایسا شعر رقم کرنا جو بظاہر آسان ہو لیکن اس ساخت میں دُشواری پیش آئے۔ایسے اشعار میں سادگی اور بیان کی لطافت ملتی ہے۔سہلِ ممتنع کے حامِل اشعار کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ نثر کے قریب ہوتے ہیں۔مذکورہ اشعار میں الفاظ کی ترتیب کو دیکھا جائے تو نثری فقرے کی ساخت محسوس ہوتی ہے۔ ادبی اصطلاحات میں پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''(شعری اظہار کی اصطلاح ہے) ایسا شعر جو اس قدر آسان لفظوں میں ادا ہو جائے کہ اس کے آگے مزید سلاست کی گنجائش نہ ہو''سہلِ ممتنع'' کہلاتا ہے۔''(۱۰۵)

ڈاکٹر مزمل حسین صنعتِ سہل ممتنع کے بارے رقمطراز ہیں:

''سہل کے لغوی معنی آسان کے ہیں جبکہ ممتنع کا مطلب دشوار یا مشکل ہے۔اصطلاح میں ایسا شعر جو بظاہر آسان ہو مگر درحقیقت ایسا کلام کہنا دشوار ہو یا اتنا آسان اور سادہ شعر جس کی نثر نہ کی جا سکے۔''(۱۰۶)

ادب میں اس مراد ہے کہ شعر کو اتنا عام فہم اور عام زبان میں لکھا جائے کہ ایک عام آدمی، قاری کو شعر پڑھنے اور کے معنی و مفہوم سے شناسائی میں کوئی دقت نہ ہو۔حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات میں لکھتے ہیں:

''لغت میں سہل آسان کے معنی میں ہے اور ممتنع دشوار کے معنی میں۔ اصطلاح میں
ایسے شعر کو کہتے ہیں جس کی مثال بنانا دشوار ہوا اگر چہ بظاہر سہل معلوم ہوتا ہو۔''(۱۰۷)

عامر بن علی نے جہاں اپنے فنی کمالات کا مظاہرہ کیا ہے وہیں پر انھوں نے عام فہم شاعری بھی لکھی ہے جو عام قاری کو اپنی شاعری سے ابلاغ عام کیا ہے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

جو قدر کرتا ہو تیری دل سے
جو راہ تکتا ہے آج تیری
اٹھو اٹھو اور آنکھیں کھولو
کہ وقت بدلا جو کیا کرو گی
سنو سنو میری جاں سنو۔۔۔!!
ہاں! ابھی مگر تم کہاں سنو گی۔۔۔!!(۱۰۸)

اس مثال کی مزید تشریح و توضیح کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ عام فہم لوگ بھی اس نظم کو ابھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔
ایک اور مثال دیکھیے:

یہ تو نے سچ کہا ہوگا
کہ جب موسم بدلتا ہے
بدل جاتے ہیں سب انساں
گئی رت جس میں ہم بچھڑے
اسے مدت ہوئی بیتے
مگر محسوس ہوتا ہے
مجھے اب بھی یہی جاناں
ابھی موسم نہیں بدلا۔۔۔!(۱۰۹)

یہ مثال بھی صنعت ممتنع کی شاندار مثال ہے۔

## صنعت سیاقۃ الاعداد

اس صنعت میں شاعر اپنے کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جو کہ عدد ہو مثلاً :دو، چار وغیرہ۔بعض علمائے بلاغت نے اس صنعت کے لیے کچھ کڑی شرائط لگا دہ ہیں مثلاً: ایک سے دس تک کے پورے عدد استعمال کرنا یا اعداد کو ترتیب وار بیان کرنا یا اُلٹی ترتیب سے کلام میں لانا۔سیاقۃ الاعداد کہلاتا ہے۔عارف حسن خان لکھتے ہیں:

''یعنی کلام میں ذکر کرنا عددوں کا خواہ ایک سے دس اور اس سے زیادہ تک خواہ برعکس اس کے ایک اور عدد خواہ ترتیب وار ہوں یا بے ترتیب۔''(۱۱۰)

صاحب نگارستان لکھتے ہیں:

''کلام میں اعداد کا ذکر کرنا چاہے وہ ترتیب سے ہوں یا بغیر ترتیب کے۔''(۱۱۱)

مولانا سعید الدین مخزن بلاغت میں لکھتے ہیں:

''کلام میں کچھ اعداد کا مناسب پیرائے اور تسلسل سے ذکر کرنا۔''(۱۱۲)

صنعت سیاقۃ الاعداد کے حوالے سے عامر بن علی کی نظموں میں سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

جوز میں کے ٹکڑوں کی
دوریوں سے اے جاناں!
وقت پیدا کرتا ہے
ایسے فاصلے اکثر
کٹ ہی جایا کرتے تھے
فاصلے بڑھے تھے جو
قرینوں کے موسم میں
دو دلوں کے بندھن میں
ایسے فاصلے جاناں!
کٹے بھی نہیں کٹتے(۱۱۳)

عامر بن علی کی نظموں میں صنعت سیاقۃ الاعداد کی ایک اور مثال دیکھیے :

اگر چہ اب بھی
چہار سو ہیں ہزار رستے
مگر اے جاناں مرے لیے تو
ہیں سب کے سب راستے یہ بے بود
کیونکہ مجھ کو کہیں بھی جاناں!
نہیں ہے جانا۔۔۔!(۱۱۴)

اس مثال میں ''چہار'' کا لفظ سیاقۃ الاعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ایک اور مثال دیکھیے :

سبھی کے مشغلے ہیں اپنے اپنے
جو ملتے بھی ہیں کچھ ایک دوسرے سے
مگر کچھ مشغلہ میرا عجیب ہے
میں سینے بانٹتا ہوں چاروں جانب
خوشی کے، درد کے، ہجر و وفا کے (۱۱۵)

اس مثال میں ''چاروں'' کا لفظ سیاقۃ الاعداد کو ظاہر کرتا ہے۔

## صنعت مراعات النظیر

کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن کے معنوں میں ایک خاص تعلق ہو مگر یہ تعلق تقابل اور تضاد کا نہ ہو۔صنعت مراعاۃ النظیر کہلاتا ہے۔مثلاً: سورج، چاند، ستاروں کا ایک جگہ ذِکر کرنا۔عامر بن علی نے اپنی نظموں میں اس صنعت کو بخوبی نبھایا ہے۔پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''علم بدیع کی اصطلاح ہے۔مراعات النظیر کو توفیق، تلفیق اور ائتلاف بھی کہتے ہیں۔
''مراعات النظیر'' اس صنعت کاری کا نام ہے جس کے ذریعے کلام میں ایسے الفاظ
لائے جاتے ہیں جن کے معنوں میں ایک خاص مناسبت اور تعلق ہو، لیکن یہ مناسبت و

تعلق، تقابل و تضاد کے نہ ہو۔''(۱۱۶)

مولانا سعید الدین مخزنِ بلاغت میں لکھتے ہیں:

''کلام میں چند ایسے معنے جمع کیے جائیں جن میں تضاد نہ ہو بلکہ بہم کسی قسم مناسبت ہو اور وہ ایک ہی سلسلے کی چیزیں ہوں۔''(۱۱۷)

منصف خان سحاب لکھتے ہیں:

''مراعات کے معنی ملحوظ رکھنا اور نظیر کے معنی مثال کے ہیں۔اس میں مماثلت کی نسبت ہوتی ہے۔تضاد کی نہیں ہوتی اسے صنعت تناسب بھی کہتے ہیں۔''(۱۱۸)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی مراعات النظیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس کو تناسب، توفیق، ایتلاف اور تلفیق بھی کہتے ہیں۔شعر یا جملے میں ایسے الفاظ جمع کرنا جو ایک دوسرے کے ساتھ سوائے نسبت تضاد کے کوئی اور مناسبت رکھتے ہوں علم بدیع کی اصطلاح میں مراعات النظیر کہلاتا ہے۔''(۱۱۹)

عارف حسن خان لکھتے ہیں:

''اس کو تناسب اور توفیق اور ائتلاف تلفیق بھی کہتے ہیں یعنی ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سوائے نسبت تضاد کے کچھ مناسبت رکھتے ہوں، جیسے چمن کے ذکر کے ساتھ گل و بلبل و باغبان و سرو و قمری وغیرہ کا ذکر کرنا۔''(۱۲۰)

عامر بن علی نے اپنی شاعری میں صنعت مراعات النظیر کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ ہو:

بہت ہی مدت کے بعد کل جب
کتاب ماضی کو میں نے کھولا
بہت سے چہرے نظر میں اترے
بہت سے ناموں پہ دل پسیجا

اک ایسا صفحہ بھی اس میں آیا

لکھا ہوا تھا جو آنسوؤں سے

کہ جس کا عنوان ''ہم سفر'' تھا(۱۲۱)

اس مثال میں کتاب ماضی کی نسبت سے چہرے اور صفحے کا ذکر اور ان کی نسبت سے آنسوؤں کا ذکر صنعت مراعات النظیر میں آتا ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ انسان کو جب بھی ماضی کی یاد ستاتی ہے اور خاص وہ وقت جب اس کو لمحہ وصل نصیب ہوا اور اب اس کو زمانہ ہجر کے قرب سے گزرنا پڑ رہا ہو تو ایسی صورتحال میں انسان کو ماضی کی یاد زیادہ ستاتی ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے:

جو صفحہ سب سے ہی معتبر تھا

کچھ اور آنسو پھر اس پہ ٹپکے

پھر اس سے آگے میں بڑھ نہ پایا

کتاب ماضی کو بند کر کے

تمہاری یادوں میں کھو گیا میں

اگر تو ملتا تو کیسا ہوتا

انہی خیالوں میں سو گیا میں (۱۲۲)

مندرجہ بالا نظم میں آنسو کی نسبت سے صفحہ اور اس کی نسبت سے کتاب اور ماضی کی نسبت سے یادوں میں کھونا اور خیالوں کا ذکر مراعات النظیر کی مثال ہے۔ صنعت مراعات النظیر کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے:

ہمیں مدت ہوئی بچھڑے

تمہیں عرصہ ہوا بھولے

مگر بارش کے موسم میں

ہوا جب گنگناتی ہو

میں اپنے گھر کی چھت پر سے

چمکتے چاند کو چھپتے
گھٹا کی اوٹ میں دیکھوں
مجھے تم یاد آتی ہو۔۔۔!!(۱۲۳)

اس مثال میں بچھڑنے سے عرصہ، بارش سے موسم، ہوا سے گنگنانا، گھر کی چھت کی نیت سے چمکتا چاند اور پھر گھٹا کی اوٹ یہ سب مراعات النظیر کی مثالیں ہیں۔

## خطابیہ انداز

اس سے مراد شاعری میں ایسا پیرایہ اظہار لانا کہ شاعری میں کسی کو مخاطب کرنا، اور اس کے ساتھ ندائیہ یا فجائیہ کی علامت کا استعمال بھی ہوا ہو۔

عامر بن علی کی شاعری میں خطابیہ انداز میں ایک جھلک ملاحظہ کرے:

رات کا غالباً آخری تھا پہر
مجھ سے تنہا ستارہ یوں گویا ہوا
ہمنشیں الوداع!
اے مرے ہمنشیں
مجھ کو نیند آ گئی
تم بھی سو جاؤ جا کر کہیں
کل ملیں گے یہیں
یہ سن کر میں ہلکا سا مسکا دیا
اس کو بتلا دیا
جانے والے یہاں لوٹتے ہی نہیں (۱۲۴)

اس مثال میں ''ہمنشیں الوداع'' اور ''اے مرے ہمنشیں'' کے الفاظ خطابیہ انداز کے ہیں۔

## صنعت تجسیم

پروفیسر انور جمال ادبی اصطلاحات میں صنعت تجسیم کے بارے رقم طراز ہیں:

''غیر مرئی حقائق، جبلات یا عادات وغیرہ کو حرکی، مادی جسم میں ڈھال کر پیش کرنا تجسیم (Personification) کہلاتا ہے۔ زندگی، موت، نفرت، غصہ، شوق، خوف، خوشی، غم وغیرہ کو جسمانی اور محسوس انسانی افعال و خصوصیات سے متصف کرنا تجسیم ہے۔''(۱۲۵)

اردو ادب میں بہت سے شعرا نے اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ حضرت اقبال کی شاعری اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ آپ کی مشہور نظمیں بھی اس صنعت سے متصف ہیں۔ کلامِ اقبال سے پہلے چند مثالیں پیش ہیں تا کہ صنعت کا صحیح مفہوم واضح ہو سکے:

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے(۱۲۶)

کلامِ اقبال کی صرف ایک مثال دیکھیے جو بالِ جبریل سے نظم ''پرواز'' سے ہے:

کہا درخت نے اک روز مرغ صحرا سے
ستم یہ غم کدہ رنگ و بو کی ہے بنیاد(۱۲۷)

علامہ اقبال نے ان اشعار میں غیر مجسم، غیر انسانی چیزوں کو انسانی صفات سے مزین کر کے ان سے مکالماتی انداز میں بات کروائی ہے۔ اسی طرح اقبال کی دیگر نظمیں، حسن و عشق، عقل و عشق وغیرہ مشہور ہیں۔

عامر بن علی کی نظموں میں صنعت تجسیم کی مثالیں پیش ہیں:

اس صحرا کا
اک اک ذرہ
میرے کان میں کہتا ہے
یوں تنہا کیوں رہتا ہے
کیا بتلاؤں

دل میں تیری

یاد کا جھرنا بہتر ہے

جی تنہا کب رہتا ہے (۱۲۸)

اس مثال میں عامر بن علی نے صحرا کے اک ذرے کو مجسم کیا ہے اور وہ شاعر کے کان میں آ کر کہتا ہے۔ وہ گفتگو کرتا ہے اور گفتگو وہی کرتا جو کسی شبنم کی قید میں ہو۔ اک ذرے کو جسم عطا کرنا فنی کمالات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

## مختصر بحر

شاعر اپنی شاعری کو بہتر سے بہترین بنانے اور اپنے فنی جمال کا مظاہرہ مختلف صورتوں میں کرتا ہے۔ کبھی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہہ کر تو کبھی بڑی بحور کا استعمال کر کے اور کبھی چھوٹی بحور پر مشتمل اشعار کہتا ہے جس سے اس کے فنی کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ انتہائی کم الفاظ میں یہ بات کہنا اس کی فصاحت و بلاغت کی نشانی ہے۔

منصف خان سحاب، نگارستان میں لکھتے ہیں:

''یعنی کسی چیز کی کوئی ایسی علت بیان کی جائے جو حقیقت یں اس کی علت نہ ہو لیکن اصل علت ظاہر ہو۔'' (۱۲۹)

پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''حسن تعلیل شعری صنعت ہے جس میں شاعر کسی واقعے کی اصل منطقی، جغرافیائی یا سائنسی وجہ کو نظر انداز کر کے ایک تخیلاتی جذباتی اور عین شاعرانہ وجہ بیان کر دیتا ہے۔'' (۱۳۰)

امام بخش صہبائی ''حدائق البلاغت'' میں لکھتے ہیں:

''صنعتِ حسن تعلیل اس کو کہتے ہیں کہ کسی وصف کے واسطے کسی شے کو علت ٹھہرالیں اور وہ شے حقیقت میں اس علت کی نہ ہو۔'' (۱۳۱)

صاحبِ مخزن بلاغت لکھتے ہیں:

''کلام میں کسی چیز کی کسی صنعت کے متعلق کوئی غیر حقیقی وجہ اور علت بیان کرنا۔'' (۱۳۲)

مختصر بحر کی مثال عامر بن علی کی نظموں سے ملاحظہ کیجیے:

شہر کو عداوت تھی
پھر بھی اے مری جاناں!
ہنس کے زخم سہہ جانا
اپنی ایک عادت تھی
قہقہے نہ دبتے تھے
خوش دلی روایت تھی
زندگی کے وہ لمحے
اب تو خواب لگتے ہیں
زندگی کے یہ لمحے
اک عذاب لگتے ہیں (۱۳۳)

مختصر بحر کی ایک اور مثال دیکھیے:

یہ کھیل پرانا ہے
لفظوں سے نہ کھیلا کرو
آنکھوں کی زباں سمجھو
جذبوں کی زباں سیکھو
محسوس جو کرتے ہو
ان سے اظہار کرو
ان کی زباں بولو
جس سے بھی پیار کرو (۱۳۴)

انسان کی شاعری اس کے جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہوتی ہے اور شاعر اپنی شاعری میں اپنے معنی ومفہوم کو بیان

کرتا ہے اور جب وہ اپنا مقام جامع انداز میں پیش کرتا ہے تو وہ کاملیت کی طرف جاتا ہے۔ عامر بن علی نے مختصر الفاظ میں، مختصر بحر میں اپنا خیال پورے جامع انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کے فنی کمالات کھل کے سامنے آتے ہیں۔

## ہندی الفاظ

لفظ ''اردو'' چونکہ خود ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی بھی لشکری زبان اور لشکر کے معنوں میں مراد لیے جاتے ہیں تو اس کا یہ خاص وصف ہے کہ یہ دیگر زبانوں کو بھی اپنے اندر ایسے سمو لیتی ہے کہ ان الفاظ کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کسی غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ کئی الفاظ اس کی مثال بن سکتے ہیں لیکن ہم عامر بن علی کی نظموں سے چند ایک ایسے الفاظ آپ کے سامنے لاتے ہیں جو ہندی کے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

تیرے پیار میں جاناں
کس طرح گزارے تھے
زندگی کے روز و شب
اور جب سمے آیا
زندگی کی راہوں پر
راستے بدلنے کا۔۔۔(۱۳۵)

اس مثال میں لفظ ''سمے'' ہندی زبان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا مطلب ''وقت'' اور منظر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

## حسنِ تعلیل

علت کا حسن، بدیع کی صنعت ہے، حُسنِ کلام ہے۔ حُسنِ تعلیل کا تعلق بدائع معنوی کے اس خاندان سے ہے جس کے افراد لف ونشر تضاد اور تجنیس وغیرہ ہیں۔ حُسنِ تعلیل شعری صفت ہے، جس میں شاعر کسی واقعے کی اصل، منطقی، جغرافیائی یا سائنسی وجہ کو نظر انداز کر کے ایک تخیلاتی جذباتی اور عین شاعرانہ وجہ بیان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کسی معلول کے لیے یہ شاعرانہ علت مبالغہ ہے لیکن جمال آفریں ہے۔ شاعرانہ طلسم کاری کا یہ کمال ہے کہ پہلی مرتبہ ذہن میں اس استدلال کو مان بھی لیتا ہے۔ منصف خان سحاب، نگارستان میں لکھتے ہیں:

''یعنی کسی چیز کی کوئی ایسی علت بیان کی جائے جو حقیقت یں اس کی علت نہ ہو لیکن اصل علت ظاہر ہو۔''(۱۳۶)

پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''حسن تعلیل شعری صنعت ہے جس میں شاعر کسی واقعے کی اصل منطقی، جغرافیائی یا سائنسی وجہ کو نظر انداز کر کے ایک تخیلاتی جذباتی اور عین شاعرانہ وجہ بیان کر دیتا ہے۔''(۱۳۷)

امام بخش صہبائی ''حدائق البلاغت'' میں لکھتے ہیں:

''صنعتِ حسن تعلیل اس کو کہتے ہیں کہ کسی وصف کے واسطے کسی شے کو علت ٹھہرالیں اور وہ شے حقیقت میں اس علت کی نہ ہو۔''(۱۳۸)

صاحبِ مخزن بلاغت لکھتے ہیں:

''کلام میں کسی چیز کی کسی صنعت کے متعلق کوئی غیر حقیقی وجہ اور علت بیان کرنا۔''(۱۳۹)

عامر بن علی نے اپنی فنی پختگی کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے اس صنعت کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ کے ہاں حُسنِ تعلیل کا فن بھی موجود ہے۔ صنعت حسن تعلیل کی بہتری مثال عامر بن علی کی نظم ''بہار آئی ہے'' ملاحظہ ہو:

پرانے زخم کھلے
اور بہت سے تازہ ملے
جدا ہوا اسی رُت میں
جو دل کے پاس آیا
مجھے بہار کا موسم
کبھی نہ راس آیا(۱۴۰)

اس مثال میں ''زخم کھلے'' حسن تعلیل سے جوڑا گیا ہے۔ پھول کھلتے ہیں لیکن شاعر نے زخم کے دوبارہ کھلنے اور درد کو کھلنے سے اور خوشبو سے علت قرار دیا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے:

اب کے سرما کی
سرد راتیں
کچھ ایسی آئیں
کہ دھڑکنیں سرد ہوگئی ہیں (۱۴۱)

اس نظم میں عامر بن علی نے بڑی خوبصورت مثال ہے۔ انسان کی سانسوں کا رکنا، یعنی جب اس کی روح اور جسم کا تعلق ختم ہوگیا اور وہ دونوں الگ الگ بن گئی۔ یہ سردی کی سرد راتوں کی وجہ سے ہوا۔ اس صنعت کا استعمال ہر شاعر کے ہاں موجود نہیں ہے۔ اس کو زیادہ تر فنی کمالات کا ماہر شاعر ہی استعمال کرتا ہے۔

## صنعتِ تکرارِ لفظی

کلام میں الفاظ کی تکرار کی صنعت کو صنعتِ تکرار کہتے ہیں۔ ایک لفظ یا کئی الفاظ کا بار بار آنا تکرار کہلاتا ہے۔ افتخار شفیع کے مطابق:

''کسی بھی شعر میں الفاظ کی تکرار سے حسن پیدا کرنے کے عمل کو ''تضاد'' کہتے ہیں۔''(۱۴۲)

عامر بن علی نے اپنے نظموں میں الفاظ کے استعمال اور تکرار کو استعمال کر کے ایسا نکھار اور حسن پیدا کیا ہے۔ تکرارِ لفظی کی مثالیں اُن کی نظموں سے ملاحظہ کیجیے:

انتظار کی شمعیں
سرد سرد جھونکوں سے
پھڑ پھڑانے لگ جائیں
اپنے سرد شانوں پر
رکھ کے سر کو مت رونا
تم اداس مت ہونا(۱۴۳)

اس نظم میں ''سرد'' اور ''سر'' کے الفاظ کی تکرار ہے اور اس سے ان الفاظ میں زیادہ نکھار پیدا ہوگا۔ ایک اور مثال

ملاحظہ کیجیے:

ابھی تلک میں وہی کھڑا ہوں
جہاں یہ تو نے کہا تھا مجھ سے
کہ اب سے جاناں
ہماری راہیں جدا جدا ہیں
نہیں ہے مجھ کو ملال کچھ بھی
جو تیری بانہوں سے میری بانہیں
جدا جدا ہیں
ابھی تلک میں وہی کھڑا ہوں
جہاں سے تو نے
پھر آخری بار مڑ کے دیکھا (۱۴۴)

اس مثال میں ''جدا جدا'' کے الفاظ کی تکرار ہیں۔ الفاظ کی تکرار سے اشعار کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کے کمال فن کا قاری کو اندازہ ہوتا ہے۔

## صنعت سوال و جواب

صنعت سوال و جواب کے حوالے سے عامر بن علی کی نظموں سے مثال ملاحظہ ہو:

تم نہ آؤ گے کل
مجھ کو ہے یہ یقیں
میری یہ بات سن کر وہ رک سا گیا
اور کہنے لگا۔۔۔!
تم سے وعدہ کروں
مجھ نہ پورا کروں

ایسا ممکن نہیں

سن میرے ہمنشیں !

میں تو انسان نہیں (۱۴۵)

اس نظم میں صنعت سوال و جواب سے مزین اشعار نظر آتے ہیں۔اس نظم میں شاعر نے سوال بھی کیا اور خود ہی اُس کا جواب بھی دیا ہے۔

مندرجہ بالا فنی خوبیاں اور علمِ کلام نیز صنائع لفظی و معنوی کے استعمال کی مثالیں جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عامر بن علی کا کلام جہاں فکری طور پر ثروت مند ہے۔وہاں فنی حوالے سے بھی عظیم الشان ہے۔عامر بن علی نے اپنے کلام میں صنائع بدائع کا استعمال اس چابک دستی سے کرتے ہیں کہ صنائع بدائع اوپری، نامانوس اور نامقبول نہیں لگتے۔بلکہ ان کا فن فکر سے ہم آغوش ہو کر شعر کی صوری اور معنوی درخشندگی کا باعث بنتا ہے۔

مختصر یہ کہ عامر بن علی اپنی نظم میں تمام حوالوں سے فکر و نظر کی بلندی پر نظر آتے ہیں۔وہ ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاعری کرتے ہیں کہ جو ایک عام آدمی کی نظر سے اوجھل ہے۔ان کی شاعری صرف خیال ہی نہیں ہے۔جذبہ اور تحرک کی شاعری ہے جو کبھی خوش کر دیتی ہے کبھی اُداس، کبھی ہنسا دیتی ہے، کبھی رُلا دیتی ہے۔ان کی نظم کے تمام موضوعات انفرادیت کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ان کی نظم اُردو شاعری کی تمام تر خوبصورتیاں سمیٹے ہوئے ہے۔

# حوالہ جات


۱۔ فیروزالدین، مولوی، فیروز اللغات، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۸۶

۲۔ سعد حسن خان، مولانا، مترجمین، المنجد، کراچی: دارالاشاعت، یازدہم، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۶۸

۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، مدیر اعلیٰ، اردو لغت تاریخی اصولوں پر، کراچی: اردو لغت بورڈ، جلد ہشتم، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۶

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص ۲۴

۵۔ غلام حسین، ذوالفقار، اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، لاہور: مطبع جامعہ پنجاب یونیورسٹی آف پنجاب، ۱۹۹۶ء، ص ۲۲۲

۶۔ مظفر عباس، اُردو میں قومی شاعری، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۸ء، ص ۴۲۔۴۱

۷۔ محمد حسین آزاد، مولانا، آبِ حیات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۲۔۸۱

۸۔ ایضاً، ص ۸۳

۰۔ محمد حسین آزاد، مولانا، آبِ حیات، ۸۳

۱۰۔ عبدالقادر سروری، اُردو مثنوی کا ارتقاء، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۴۴ء، ص ۲۴

۱۱۔ غلام حسین ذوالفقار، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، لاہور: مطبع جامعہ پنجاب، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۲۷

۱۲۔ ناہید کوثر، ڈاکٹر، اردو شاعری کا ارتقاء، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۳

۱۳۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، لاہور: المطبۃ العربیۃ پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۴ء، ص ۹۱

۱۴۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۰ء، ص ۶۱

۱۵۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۹۔ ادیب، مسعود حسن، سید، رضوی، ہماری شاعری، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۸۹

۲۰۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص ۱۱۹

۲۱۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۵ء، ص ۱۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۳۔ ایضاً،ص۲۱

۲۴۔ ایضاً،ص۵۱

۲۵۔ ایضاً،ص۷۰

۲۶۔ ایضاً،ص۷۶

۲۷۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں،ص۱۰۴

۲۸۔ عامر بن علی، سرگوشیاں،ص۴۹

۲۹۔ ایضاً،ص۴۸

۳۰۔ ایضاً،ص۶۹

۳۱۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی،ص۲۷

۳۲۔ ایضاً،ص۲۸

۳۳۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو،ص۲۰

۳۴۔ ایضاً،ص۳۵

۳۵۔ ایضاً،ص۸۳

۳۶۔ ایضاً،ص۹۰

۳۷۔ ایضاً،ص۱۰۵

۳۸۔ ایضاً،ص۱۰۶

۳۹۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں،ص۵۱

۴۰۔ ایضاً،ص۸۲

۴۱۔ ایضاً،ص۱۰۹

۴۲۔ ایضاً،ص۱۱۲

۴۳۔ ادیب، مسعود حسن، سید، رضوی، ہماری شاعری،۴۹

۴۴۔ عامر بن علی، سرگوشیاں،ص۳۱

۴۵۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو،ص۴۳

۴۶۔ ایضاً،ص۸۲

۴۷۔ ایضاً،ص۱۲۴

۴۸۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، ص ۳۸

۴۰۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، ص ۲۹

۵۰۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص ۳۸

۵۱۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، ص ۶۳

۵۲۔ عامر بن علی، محبت چھو گئی دل کو، ص ۶۰

۵۳۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، ص ۵۰

۵۴۔ ایضاً، ص ۵۱

۵۵۔ ایضاً، ص ۵۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۹۸

۵۷۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص ۴۸

۵۸۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، ص ۶۵

۵۹۔ ایضاً، ص ۸۱

۶۰۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، ص ۶۳

۶۱۔ ایضاً، ص ۷۰

۶۲۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص ۳۲

۶۳۔ عامر بن علی، محبت چھو گئی دل کو، ص ۷۳

۶۴۔ ایضاً، ص ۸۱

۶۵۔ ایضاً، ص ۸۱

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۶۹۔ عامر بن علی، یاد نہ آئے کوئی، ص ۸۷

۷۰۔ عامر بن علی، چلو اقرار کرتے ہیں، ص ۲۹

۷۱۔ ایضاً، ص ۳۵

۷۲۔ ایضاً، ص ۷۹

۷۳۔ عطاالحق قاسمی، یہ سخن جو تم نے رقم کیے، مشمولہ: محبت چھوگئی دل کو، عامر بن علی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت سوم، اگست ۲۰۱۱ء، ص:۱۳

۷۴۔ سحاب، منصف خان، نگارستان، لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۰ء، ص:۱۴۳

۷۵۔ کوثر، سعیدالدین، مولانا، مخزن بلاغت، پشاور: کتب خانہ الضاریہ، س ن، ص:۲۴

۷۶۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۲ء، ص:۶۴۔۶۳

۷۷۔ عابد، سید عابد علی، البیان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص:۸۸

۷۸۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت سوم، ۲۰۱۱ء، ص:۱۹۔۱۸

۷۹۔ ایضاً، ص:۲۹

۸۰۔ ایضاً، ص۹۸

۸۱۔ سحاب، منصف خان، نگارستان، ص:۱۴۷

۸۲۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۱۸

۸۳۔ ابولاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۱۲

۸۴۔ مولانا سعیدالدین کوثر، مخزن بلاغت، ص:۴۲

۸۵۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت پنجم، ۲۰۱۰ء، ص:۴۲

۸۶۔ ایضاً، ص:۴۳

۸۷۔ ایضاً، ص:۹۷

۸۸۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۴۷

۸۹۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۴۷

۹۰۔ قمر نقوی، اُردو شاعری کی آخری کتاب، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء، ص:۱۱۶

۹۱۔ عامر بن علی، محبت چھوگئی دل کو، ص:۹۲

۹۲۔ ایضاً، ص:۹۳

۹۳۔ ایضاً، ص:۱۸۸

۹۴۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۶۷

۹۵۔ ابولاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۳۹

۹۶۔ سحاب، منصف خان، نگارستان، ص:۱۶۱

۹۷۔ عارف حسن خان، تلخص بحرالفصاحت، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۶ء، ص:۳۷۱

۹۸۔ کوثر، سعیدالدین، مولانا، مخزن بلاغت، ص:

۹۹۔ صہبائی، امام بخش، حدائق البلاغت، (ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر مزمل حسین)، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص:۱۱۸

۱۰۰۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۳۴

۱۰۱۔ غالب، اسداللہ خان، دیوان غالب، ص:۷

۱۰۲۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۲۸

۱۰۳۔ ایضاً، ص:۳۸

۱۰۴۔ ایضاً، ص:۴۴

۱۰۵۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۲۱

۱۰۶۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، ادبی مطالعات، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص:۱۱۹۔۱۱۸

۱۰۷۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۱۰۵

۱۰۸۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۶۷

۱۰۹۔ ایضاً، ص:۸۲

۱۱۰۔ عارف حسن خان، تلخیص بحرالفصاحت، ص:۳۵۴

۱۱۱۔ منصف خان سحاب، نگارستان، ص:۱۷۶

۱۱۲۔ کوثر، مولانا سعیدالدین، مخزن بلاغت، ص:۹۵

۱۱۳۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۳۲

۱۱۴۔ ایضاً، ص:۳۶

۱۱۵۔ ایضاً، ص:۵۵

۱۱۶۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص:۲۵۲

۱۱۷۔ کوثر، مولانا سعیدالدین، مخزن بلاغت، ص:۱۰۳

۱۱۸۔ منصف خان سحاب، نگارستان، ص:۱۶۵

۱۹۱۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص:۱۶۹

۱۲۰۔ عارف حسن خان، تلخیص بحرالفصاحت، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۶ء، ص:۳۷۵

۱۲۱۔ عامر بن علی، سرگوشیاں، ص:۲۱

۱۲۳۔ ایضاً،ص:۲۲

۱۲۴۔ ایضاً،ص:۵۹

۱۲۵۔ ایضاً،ص:۲۵

۱۲۶۔ انور جمال، پروفیسر،ادبی اصطلاحات،ص:۴۸

۱۲۷۔ اقبال،علامہ محمد،کلیاتِ اقبال،ص۶۱

۱۲۸۔ ایضاً،ص:۴۹۳

۱۲۹۔ یضاً،ص:۲۸

۱۳۰۔ سحاب،منصف خان،نگارستان،ص:۱۶۴

۱۳۱۔ انور جمال، پروفیسر،ادبی اصطلاحات،ص:۹۱

۱۳۲۔ صہبائی،امام بخش،حدائق البلاغت،ترتیب وتہذیب،ڈاکٹر مزمل حسین،ص:۱۳۶

۱۳۳۔ کوثر،مولانا سعیدالدین،مخزن بلاغت،ص:۱۱۷

۱۳۴۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص:۷۲۔۷۱

۱۳۵۔ ایضاً،ص:۶۸

۱۳۶۔ ایضاً،ص:۱۷

۱۳۷۔ سحاب،منصف خان،نگارستان،ص:۱۶۴

۱۳۸۔ انور جمال، پروفیسر،ادبی اصطلاحات،ص:۹۱

۱۳۹۔ صہبائی،امام بخش،حدائق البلاغت،ترتیب وتہذیب،ڈاکٹر مزمل حسین،ص:۱۳۶

۱۴۰۔ کوثر،مولانا سعیدالدین،مخزن بلاغت،ص:۱۱۷

۱۴۱۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص:۲۳

۱۴۲۔ ایضاً،ص:۴۱

۱۴۳۔ افتخار شفیع،اصناف شاعری،لاہور: کتاب سرائے،۲۰۱۱ء،ص:۱۳۲

۱۴۴۔ عامر بن علی،محبت چھوگئی دل کو،ص:۲۴

۱۴۵۔ ایضاً،ص:۳۵

۱۴۶۔ ایضاً،ص:۲۶

باب چہارم

# عامر بن علی کا ہم عصر شعرأ میں ادبی مقام و مرتبہ

باب چہارم

# عامر بن علی کا ہم عصر شعرا میں ادبی مقام و مرتبہ

ہر ذی فہم اور منطقی سوچ کے حامل شخص کی طرح عامر بن علی بھی روزمرہ کے حادثات و واقعات سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے مگر وہ انہیں اپنی ہی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ انہیں دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے اخذ کردہ نتائج سو فیصد درست ہوتے ہیں اور اس امر کے شاہد ہیں کہ وہ اپنی عمر سے بہت آگے تک سوچ سکتا ہے۔

عامر بن علی کا مقام و مرتبہ دورِ حاضر میں بہت سے شعرا سے منفرد اور نمایاں ہے۔وطن عزیز کے نام ور شعرا اور ناقدین نے عامر بن علی کی شاعری اور ان کے فکر و فن کے حوالے سے اپنے مقالات کے ذریعے فکر انگیز گفتگو کی جن میں سے چند شعرا کے مقالات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔جن میں چند ایک اقتباسات پیش خدمت ہیں:

عباس نقوی اپنے مقالے میں عامر بن علی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''آج اسلام آباد پہنچے دو دن گزرنے کے بعد ذرا اوسان بحال ہوئے ، دفتری مصروفیات سے قدرے افاقہ ہوا تو لفافہ کھول کر دیکھا۔۔خوبصورت سرورق اور بہترین کاغذ و چھپائی سے مزین مجموعہ میرے ہاتھ میں تھا اندرونی سرورق کا آغاز مولائے کائنات کے قول سے کیا گیا ہے۔۔۔کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ۔
> مزید دیکھنا شروع کیا۔۔اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔۔۔جا بجا کربلائی حوالے کچھ اس طرح پروئے ملے کہ دماغ کربلا سے باہر نکل ہی نہیں پا رہا۔اور شاید شاعر موصوف بھی نہیں چاہتے کہ قاری کسی بھی طور کربلائی ماحول سے باہر نکل سکے۔۔۔۔۔پہلے ہی کلام کے نہایت مشکل بحر میں دو اشعار ملاحظہ ہوں:
>
> عجب اسرار ہے اسرار کو، اسرار میں رکھا گیا ہے
> مرے شبیر کا اثبات بھی انکار میں رکھا گیا ہے

ہے نور و نار میں بالشت بھر کا فاصلہ، حر نے یہ پایا
حسینی قافلے کو چشمہ انوار میں رکھا گیا ہے

کربلا والوں کی یاد میں بعد عاشور دربار و بازار کی صعوبات کی یاد دلاتے ہیں۔''(۱)

دوستوں کی بے اعتنائی، اپنوں کی بے مروتی اور اعدا کے دیئے ہوئے زخموں سے لہولہان ہونے اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے کے باوجود یہ خود کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا بلکہ پندارِ ذات کے چور چور آئینے کے کسی ایک ٹکڑے سے ہی عکس گری کا ہنر جانتا ہے اور نئے امکانات کی صورت گری کے فن سے واقف ہے۔

تبسم نواز وڑائچ عامر بن علی کی شاعری کے فکری و فنی حوالوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس شعری مجموعہ کے مطالعہ کے بعد دھان پان جسامت والا عامر بن علی کہیں گم ہو جاتا ہے اور ایک ایسا بلند بانگ، بلند آہنگ، جی دار، باہمت اور طرح دار عامر بن علی ہمارے ذہن پہ اپنا نقش جمانے میں کامیاب ہو جات ہے جو نغمہ گر بھی ہے اور نوحہ خواں بھی۔ جو عشق میں سرشار بھی ہے اور اپنی بیتابیوں کے حوالے سے ایک بیقرار روح بھی لئے پھرتا ہے لیکن یہ بے قراری خوب سے خوب تر کی جستجو لئے ہوئے ہے ایسے فکری مجاہد اور فنی مہارت کے حامل قلمکار کو اگر ہم خراج تحسین پیش کرنے میں بخل سے کام لیں تو یہ ادب کیساتھ زیادتی ہوگی۔''(۲)

ان کے یہ الفاظ عامر بن علی اور اُن کی شاعری کا صحیح تعارف کرانے میں بالکل کامیاب نہیں بلکہ کتاب کو جب تک پورا پڑھا نہ جائے۔ کتاب میں جو حرف وصوت کے اسرار و رموز، حسن کی شوخیاں، عشق کی گرمیاں، وصال کی لذتیں، فراق کی حدتیں اور احساس کی شدتیں موجزن ہیں اور خونِ جگر سے معجزہ فن کی جو صورت گری ہے اس کی ایک جھلک بھی ہم پہ عیاں نہیں ہو پائے گی۔

تبسم نواز وڑائچ اُن کی ایک نظم کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اس کے فکری موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''عامر بن علی نے ایک عمدہ نظم تخلیق کی ہے اور اس نظم کا کمال یہ ہے کہ باوجود ایک وسیع

کینوس کے اسے بہت مہارت سے چند مناظر میں سمو کر اپنی تخلیقی و تخیلاتی ہنر کاری کا بہترین ثبوت مہیا کیا ہے کہ اختصار کے باوجود اس کے وسیع منظر نامے میں بالکل فرق نہیں آنے دیا، مجھے تو اس نظم نے حیرت زدہ کر دیا ہے۔ بچپن، لڑکپن، شباب، ادھیڑ پن، ہجر و فراق و وصال کی لذتیں ہجر کی اذیتیں، زمانے کے لگائے ہوئے نشتر، اپنوں کی طرف سے کھائے ہوئے چرکے، وقت کی ریت کا دھیرے دھیرے عمر کی مٹھی اور بدن کی گرفت سے سرکتے جانا، معاشرتی اقدار کی شکست و ریخت، اخلاقیات کی زوال پذیری اور فکر و فن کا ابتذال، غم جاناں و غم دنیا کا حسین امتزاج سب کچھ ہی تو عامر بن علی نے اس میں سمو دیا ہے اس کے باوجود کہ نظم کو مختلف ادوار اور کیفیات سے منعکس کیا ہے لیکن اس کی یکجائی اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی کثیر الجہتی میں بھی یکجہتی کا ایک خوبصورت عکس رواں دواں ہے جو ایک کامیاب قلمکاری کی عمدہ مثال ہے۔''(۳)

جاوید اقبال زاہد عامر بن علی کی شاعری، اُن کی شخصیت، اُن کی خدمات کے صلے میں اُن کو منظوم خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

سفر! آخر سفر ہے، جس جہاں کا ہو
زمیں یا آسماں کا ہو
یقیں کا، بے یقینی کا
ادب میں نکتہ چینی کا
زباں کا یا بیاں کا ہو
سفر اندر کی دنیا کا ہو یا باہر کی دنیا کا
سفر آخر سفر ہے جس جہاں کا ہو
نشاں یا بے نشاں کا ہو
حقیقت یا گماں کا ہو

مرے عامر

سفر میں شرطِ اول ہے

مسافت اور تھکن دونوں

برابر ساتھ چلتے ہیں

سیانے لوگ کہتے ہیں

قدم جو بھی اٹھانا ہو

بھلے جو بھی زمانہ ہو

سفر سے پیشتر

رختِ سفر کو جانچنا بے حد ضروری ہے

مسافت اور منزل کا تعین

جو بھی ہے، جتنی بھی دوری ہے

عزیزِ من!

وہ دکھ جو دل کے اندر ہوں

انہیں بھی ساتھ لے لینا

جو یادیں خوبصورت ہوں

انہیں ساماں میں رکھ لینا

وسیلے کی دعاؤں سے سبھی

جیبوں کو بھر لینا

سفر کرتے سمے

سورج کو اپنی پشت پر رکھنا

ہواؤں کے موافق چلتے رہنا بھی
سفر میں کامیابی، کامرانی کی ضمانت ہے
تسلسل سے چلے جانا

پڑاؤ کم سے کم رکھنا
ہمیشہ اپنے جذبوں کو
سفر میں تازہ دم رکھنا
مرے شاعر!
تری اس زندگی کے ہر سفر کو جانتا ہوں میں
تمہیں پہچانتا ہوں میں
تمہیں شاعر نہیں کہتا ہوں
شاعر مانتا ہوں میں
مگر اک مشورہ میرا ہے
پلے باندھ کر رکھنا
سنو!
اس شہرِ لب بستہ میں یونہی بولتے رہنا
محبت سے بھری مٹھی کو سب پر کھولتے رہنا
سماعت کے دریچوں میں یونہی رس گھولتے رہنا
ترے اشعار ہی ردِّ بلا کا
اسمِ اعظم ہیں
ہمارے واسطے شعروں کی تسبیح

رو لتے رہنا

یونہی سچ بو لتے رہنا

یونہی سچ بو لتے رہنا(۴)

قیام پاکستان کے بعد کے غزل گوشعراء تہذیبی وثقافتی مرکز کی تلاش میں سرگرداں ہوئے تو اِسلامی ثقافت کے مختلف انداز مختلف گروہوں کے ہاں نظر آنے لگے۔

عامر بن علی کا غزلیات اور نظموں پر مبنی تازہ مجموعہ کا مسودہ زیرِ مطالعہ ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس بہت مختصر سے مضمون میں ان کی غزل پر گفتگو ہو اکثر و بیشتر ایسا نہیں ہوتا کہ ایک شاعرِ خوش بیاں کا قلم ہو، ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرتی، لفظ و معانی کی گرہیں کشادہ کرتی، آتشِ شوق کو سیراب کرتی، رواں دواں غزل بھی ہو اور کہیں حسنِ بے مثال، عشقِ شیریں مقال، زلفِ گرہ گیر، شادیانہ وصال اور اندوہِ فراق کا ذکر تک نہ آئے اور غزل کا حسن بھی مجروح نہ ہو، یہ خصوصیت عامر بن علی کی غزل میں موجود ہے۔ اگر دو ہی لفظوں میں ان کی شاعری کا احاطہ کیا جائے تو وہ خاک اور خون ہیں۔ خاک کا استعارہ عامر بن علی نے اپنے بدن کی خاک سے لیکر اپنے وجود کی کم مائیگی، بے ثباتی اور انکساری کیلئے بہت خوبصورتی سے جا بجا اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔

مجید اختر ''خاک اور خون کا شاعر'' کے عنوان سے اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''دوسرا لفظ جو میرے نزدیک ان کی شاعری کی بنیاد ہے وہ ہے خون، عامر بن علی کبھی آشوبِ زمانہ کے ہاتھوں ارزاں ہونے والے انسانی خون کا ماتم کرتے ہیں اور کبھی اپنے قارئین کو کشاں کشاں ساتھ لئے، عقیدتوں کے گلدستے اپنے قلم سے سجائے اس خونِ مقدس کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں کہ جس کی حُرمت کی گواہی خود پیمبر ﷺ نے بیان فرمائی۔ غزل کے دوران اس خوبصورتی سے کربلا کا استعارہ در آتا ہے کہ نہ غزل کی روانی میں فرق آتا ہے نہ ہی قاری محسوس کر پاتا ہے کہ آناً فاناً اسے بیان و کلام کی کس بلندی پہ پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ سب اس لئے کہ عامر بن علی خود اپنی مستی میں حضور و غیاب کی منازل کو سر کرتے ہیں۔ ان مراحل میں جہاں روانی و آمد کی فراوانی ہے وہاں

آورد کا نہ ہونا قابلِ رشک ہے۔''(۵)

شعر کا لفظ شعور سے مشتق ہے اور شعر اپنے اصل میں شعور کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ شعر میں شعور کا اظہار ایک خاص سلیقہ بھری بنت سے کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں شعر، شعور یعنی بات کا بیان ہے۔ اس بات کو ایذرا پاونڈ نے کچھ یوں بیان کیا ہے، اچھی تخلیق وہ ہے جو سادہ، واضح اور قطعی ہو، تخلیقی عمل میں ایک طرح کا ضبط لازم ہی ہے اور اس ضبط کا مظاہرہ وہی فنکار کر سکتا ہے جو اپنے تجربے پر دسترس رکھتا ہو۔

ناصر علی جو کہ حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سیکرٹری جنرل ہیں اور وہاں کے ادبی حلقہ جات میں ان کا ایک نمایاں مقام ہے۔ وہ عامر بن علی کے شعری شعور اور فکری وفنی حوالوں اور تخلیقی عمل کے بارے میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''اس کتاب کا مطالعہ کریں تو آپ کو بہت سے اشعار اور نظمیں ایسی ملیں گی جو تصدیق کرتی ہیں عامر بن علی جاگتی آنکھوں سے شاعر ہے۔ اس کا زندہ دھڑکتا دل، گزرتے وقت میں ہوتی واردات سے لاتعلق نہیں بلکہ ہوتی واردات کو شعر کر کے قاری کے دل کی دھڑکن میں احساس کی چنگاریاں پیدا کر دیتا ہے، یوں قاری اپنے عہد سے استوار کرتا نظر آتا ہے۔ یہ وہ کام ہے جو باشعور شاعر کا کارِ اصلی ہے یعنی اپنے فن کے ذریعے تبدیلی پیدا کرنے کے عمل کو تیز کرنے کا فریضہ انجام دینا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں شعور اور تخیل کے ملاپ سے کیا مفہوم لیتا ہوں۔ میرے نزدیک تجربے سے حاصل شدہ اطلاعات کو شعور کہا جا سکتا ہے جبکہ غیب سے حاصل شدہ مواد تخیل کہلاتا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ عامر بن علی کی شاعری میرے اس قضیئے پر کتنا درست بیٹھتی ہے:

دیئے کی آنکھ میں بجھنے کا خوف در آیا
مگر ہوائے ستم گر کی خود سری نہ گئی

اس شعر میں ہوائے ستم گر ہمارے تجربے سے گزرنے والے عمل ہیں۔ جبکہ دیئے کی آنکھ میں بجھنے کا خوف، تخیل کی اڑان یعنی صدائے غیبی ہے جو تخلیقی لمحات میں کہیں غیب سے اتری اور شاعر کے کلام کا حصہ بن گئی۔

اک طرف لمحہ بہ لمحہ ارتقاء
اک طرف تاریخ سے انکار ہے

تاریخ سے انکار ہر باشعور شاعر کے شعور کا حصہ ہوتا ہے لیکن لمحہ بہ لمحہ ارتقا کا احساس، شاعرانہ تخیل کی اپج کا نتیجہ ہے اور ہم، جن کے لیے طوق و رسن کا اہتمام ہو رہا ہے۔ جو اپنا ہونا بھگت رہے ہیں۔ سو یہ تن بیتی ہمارے سامنے کے شعور کا حصہ ہیں۔''(۶)

انسان جب دوسروں سے لڑتا ہے تو خطابت پیدا ہوتی ہے جب خود سے لڑتا ہے تو شاعری جنم لیتی ہے۔ عامر بن علی کا مجموعہ کلام ''محبت کے دو رنگ'' اس امر کا غماز ہے کہ سچائی کی جستجو اِس کا مسئلہ ہے اور تلاشِ خدا اس کو خود سے الجھنے پر اکساتی رہتی ہے۔

صوفی، رنگ نسل زبان مذہب سے بالاتر صرف انسان سے محبت کرتا ہے زمانے بھر کے تجربات مشاہدات کو جذب کرتا ہے لیکن بیان نہیں کرتا۔ صرف شاعر کو یہ ملکہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ بیان پر قدرت رکھتا ہے۔ جیسا کہ درج بالا شعر میں بین المذاہب کو موضوع کیا گیا ہے۔ یہی تلاش کی سچائی کا معتبر حوالہ عامر بن علی کے کلام میں موجود ہے۔

ڈاکٹر ارشد معراج اپنے مقالہ میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

''کائنات کے اسرار و رموز پر غور و فکر فلسفیوں، مفکروں، دانشوروں کے ساتھ ساتھ تصوف کا خاص موضوع ہے، لیکن شاعر کا مسئلہ کچھ اور انداز کا ہے۔ دروں سے بروں اور بروں سے دروں کا سفر ایک زقند میں نہیں بھرتا بلکہ جرعہ جرعہ اس پر اسرار کھلتے ہیں اور عامر بن علی کہتا ہے:

عجب اسرار ہے اسرار کو اسرار میں رکھا گیا ہے

اسراروں بھری کائنات میں جہاں انسانی ذہن ایک اسرار ہے وہاں شاعر اور اس کا تخلیقی عمل سب سے بڑا اسرار ہے جسے گرفت میں لینا قولِ محال کے مترادف ہے۔ عامر بن علی اِن اسراروں بھرے اسرار کو آئمہ کے توسط سے پانے کی کوشش میں ہیں، یہ

اسراراس پر منکشف ہوتے ہیں تو وہ انہیں شعری قالب میں ڈھالتا ہے اور ذکر کرتا ہے،

نفس و انفاس میں اِثبات میں اصحاب کا ذکر

علم و اولی الامر و اولی الباب کا ذکر

شعر کیا ہوتا ہے آپ سب جانتے ہیں شعر بانگ و بلند دعویٰ نہیں ہے شعر ساتویں منزل پر کھڑے ہو کر اعلان کا نام نہیں شعر اسرار کے دھیمے اظہار کا نام ہے شعر سرگوشی ہے جو عامر بن علی نے میریکان میں کی اور میں نے آپ تک پہنچائی شعر، کثافت کو لطافت میں ڈھال دینے کا نام ہے شعر جذبوں کے پرداخت کا نام ہے۔ عامر بن علی نے شعر کا اعتراف شعر کہہ کر کیا ہے۔ عامر بن علی سماج کا نبض شناس ہے۔ سماجی ناہمواریاں اُسے اکساتی ہیں کہ وہ برملا اظہار کرے۔ مقتدر بالادست طبقات کے استحصالی ہتھکنڈے عامر بن علی کے دل و دماغ پر کچوکے لگاتے ہیں۔''(۷)

اگر شعرا کے ہاں ایک صفت کو شامل کیا جائے کہ مشاہدہ کے ساتھ پرکھ اور تجزیہ کی صلاحیت ان کے کلام سے ظاہر ہو تو ان کا درجہ مفکر شعرا کے ہاں کسی بھی مقام پر ظاہر ہوگا۔ لیکن عامر بن علی کا مقام باقی شعرا کے مقابلے میں منفرد اور نمایاں ہے۔

باسط آزر ''عامر بن علی ایک ارتقا ایک شاعر'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''عامر بن علیمیاں چنوں سے تعلق رکھنے والا ایک منفرد شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اس سر زمین کی مٹی میں فن اور لطافت ہزاروں برس قبل سے شامل ہے۔ عامر بن علی اسی مٹی کا بیٹا ہے جس میں شدت کا عنصر انتہائی کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یہاں دوستی، امن، محبت اور فن اپنے اندر گمنامی اور بے غرضی کی صفات لیے ہمیشہ وقت کے دھارے کے ساتھ چلتے رہے۔ یہی صفات ہم عامر بن علی کی شاعری میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس شاعر کے ہاں موجود موضوعاتی اور صفاتی تنوع کے بارے گفتگو کرنا مختصر وقت میں ممکن نہیں، مگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ عامر بن علی حقیقت پسندانہ تغیر اور ارتقا کا شاعر ہے۔ جس میں حقائق کی تلخی کے ادراک کے ساتھ سچائی اور مثبت فکر و عمل کے آگے بڑھتے رہنے کی

روش کا اظہار بہت واضح موجود ہے۔ کیونکہ وہ تاریخ اسلام سے متاثر ہے اسی کا رن اس کے ہاں ان موضوعات کے مضامین وہیں سے ترتیب پاتے اور رہِ اظہار منتخب کرتے ہیں۔''(۸)

عامر بن علی کا کلام اور ان کے ہاں موجود بیانیہ کی جہات انہیں اشعار سے واضح ہو جاتی ہیں۔ ان کے کلام کا بغور جائزہ لینے کے بعد ان کے ہاں ہماری شعری روایت واضح جھلکتی ہے اور اسی کے ساتھ اس میں جدید ادبی افکار کے ساتھ مطابقت بھی پائی جاتی ہے۔ اس مطابقت کو ایک فطری ارتقا کہا جا سکتا ہے۔ جدید ادبی افکار جو کہ تمام پختگی تک پہنچ کر نظریات کی صورت سامنے آتے ہیں، اگر دیکھا جائے تو لامحالہ ادب کا سفر ان راستوں سے ہو کر ہی گزرتا ہے، اگر کسی زبان میں ان کے ساتھ مطابقت پائی جاتی ہے تو ان کو فقط ادبی افکار اور تنوع کی مثال سمجھا جا سکتا ہے۔ عامر بن علی کے ہاں جس حد تک ان کا اظہار یا اس سے مطابقت پائی جاتی ہے تو اس کو فطری اس حوالہ سے کہا جا رہا ہے کہ ایسا ارادتاً نہیں ہو رہا بلکہ تشریحات و تفہیم کی ان جہات کی طرف آتے ہی ان کے اشعار کے معانی اور جہات میں وسعت محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاعر فقط شعر کہتا ہے اور شعر اپنی معنوی جہات کو خود متعین کرتا ہے اور ایک آزاد تخلیق کی صورت اپنا وجود ظاہر کرتے ہوئے قاری، نقاد اور مفکر کے ہاں الگ الگ مفاہیم کی الگ الگ منازل کا سفر کرنے لگتا ہے۔

باسط آزر مزید لکھتے ہیں:

''ان کے ہاں اختتام اور انجام کا مطلب کلی فنا نہ ہونے کے باوصف ان میں تغیر کی زندگی پائی جاتی ہے جو انہیں فکری اور فنی لحاظ سے مضبوط اور رجائیت پسند ثابت کرتی ہے اور ان کے ہائی کہیں کہیں مغمومیت کا عنصر فقط جذبات کا وقتی اثر کے پردے میں پناہ لے لیتا ہے۔ المختصر عامر بن علی کی نئی شاعری کو میں لاہور میں ایک نئی جہت کی طرف سفر کرنے والے ایک شاعر کی شاعری کہوں گا جو کہ فکری جمود اور فنی تجربات سے علیحدہ ہو کر فکری طور پر اپنی رہبری میں خود رواں دواں ہے اور اس سے مستقبل میں اس سے بھی بہتر کا یقین ہوتا ہے اور ان کے ہاں یہ ارتقا نئے آنے والے شعرا کو فکری و فنی وسعت اختیار کرنے اور اپنی راہوں کا خود تعین کرتے ہوئے ارتقائے ادب میں عزم،

حوصلہ اور رہبری عطا کرنے کے قابل ہے۔ پاک سرزمین کے لیے ان کی نئی کتاب
ایک خوبصورت ادبی وفکری تحفہ ہے۔ جس میں کربلائی استعارے عہدِ حاضر کے
المیات کے معانی اوڑھے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔''(۹)

عامر بن علی ایک ملنگ طینت اور محبتی انسان ہیں جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن پہ مجھ حرف ناشناس سے بھی رائے مانگی ہے، عامر بن علی کے مجموعہ ہائے کلام کے مطالعہ نے مجھے عامر بن علی کے فن کے ساتھ ساتھ اپنی کم مائیگی کے اعتراف پر بھی مائل کیا ہے ہر دوسرا شعر پڑھتے ہوئے یہ احساس جاگتا ہے کہ کاش یہ شعر میں نے کہا ہوتا۔ ان کا کلام عرفان سے لبالب ہے۔ افتخار حیدر ان کی محبت اہلِ بیت اور ان کی شاعری کے مذہبی حوالے سے لکھتے ہیں:

''کائنات کے ہر حق پرست کے لئے منبعِ نور وعرفان ہے اور عارف نے اسی بجھے
چراغ سے اپنا سینہ روشن کیا ہوا ہے۔ علم کا موضوع ہو یا اخلاق کا، ہجر کی بات ہو یا وصل
کی، عشق کا میدان ہو یا شجاعت کا مجھے عامرؔ کے فکر وعرفان کے سوتے، چشمہ اہلبیت
سے ہی پھوٹتے نظر آئے ہیں۔

بجانا بند کرو شادیانے ، اہلِ حکم
شکست کس کو ہوئی ہے سنو اذاں ہے گواہ

عامر بن علی ہر شاعر کی طرح امید کے ساتھ دن گزارتا ہے اور امید کے بستر پر شب
بسری کرتا ہے اور امیدوں کے ساتھ ہی حیاتِ آئندہ کی ڈوری کو باندھے ہوئے
ہے۔''(۱۰)

کرب سے یاری، شاعر کا نصیبا ہے تو درد کی ٹہل سیوا کرنا اس کا شوق، سو عارف اس معاملے میں خوش نصیب بھی ہیں اور پرشوق بھی، ان کے ہاں اس قبیل کے بیسیوں شعر ملتے ہیں۔ باسط آزران کے قرب، دکھ اور ہجر کے حوالے سے کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''اسرارِ کائنات کا کھوج ہر شاعر کی سرشت کا حصہ ہوتا ہے، اپنے اردگرد دیکھنا، حیرت
کرنا، سوال کرنا، گنجھل دار بجھارت کے گنجھل کھولنے کی کوشش کرنا، یہ عمل عامر بن علی

کی شاعری میں ابھرابھر کر سامنے آتے ہیں:

عجب پیچیدگی ہے ، ہم کہاں لائے گئے ہیں
مشیت اور اذیت کے مَیاں لائے گئے ہیں
کلیسا ، مسجد و مندر میں ، گردوارے میں
بھٹک رہا ہوں تلاشِ خدا میں رہتا ہوں

عامر بن علی کے کلام کی حدت، کسک اور تہہ داری کو اس مضمون میں سمونا نہ تو میرا منصب ہے اور نہ ہی مجھ میں استعداد، میں ایک حرف ناشناس اس امید پہ ہوں کہ کوئی اہلِ علم آگے بڑھے اور ان کے لفظوں میں چھپے رموز تک ہمیں رسائی دے۔''(۱۱)

اپنی بااخلاق فطرت کے سبب عامر بن علی ایک وسیع حلقۂ احباب رکھتے ہیں اور ان کے تمام دوست ان کی ہمدرد اور پرخلوص دوستی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ عامر بن علی ایک دردمند دل اور حساس طبیعت رکھنے والے انسان ہیں جو کسی جانور کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بھی اس تاثر سے خالی نہیں خصوصاً ان کے کلام میں اس کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ عامر بن علی ظاہر و باطن میں ایک مکمل اور بہترین شخصیت کے مالک ہیں۔

عامر بن علی ایک ہمدرد انسان ہیں وہ اپنے دوستوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ان کا خیال رکھتے ہیں ان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ہر جگہ انہوں نے ادیبوں اور دانشوروں کو خود تلاش کیا۔ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود شعری سفر جاری رکھا۔ انہوں نے اپنی گھریلو اور علمی و ادبی، دونوں حیثیتوں کو برابر رکھا اور ان کے ساتھ انصاف کیا۔ ایک بات جو میں محسوس کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ عامر بن علی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ کسی حد تک انہیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان کے حوالے سے تحقیقی کام کی زیادہ ضرورت تھی۔ ان کے بارے میں کم لکھا گیا جب کہ زیادہ لکھے جانے کی گنجائش تھی۔ جس کی آنے والے وقت میں توقع کی جاسکتی ہے۔